مارکسزم ہمارے عہد میں

تحریر: لیون ٹراٹسکی

ترجمہ: حسن جان

نظر ثانی ترجمہ: راشد خالد

ٹراٹسکی نے یہ مضمون 1939ء میں Otto Ruhle کی جانب سے کی جانے والی مارکس کی سرمایہ کی تلخیص کے تعارف کے طور پر لکھا تھا۔ اسے ایک پمفلٹ کے طور پر بھی شائع کیا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ سب سے پہلے انٹرنیٹ پر ''مارکسزم کے دفاع میں (marxist.com) ویب سائٹ پر شائع ہوا تھا۔

یہ کتاب مختصراً مارکس کی معاشی تعلیمات کی اساس کو مارکس کے اپنے الفاظ میں پیش کرتی ہے۔ بہر حال قدرِ محنت کے نظریے کو خود مارکس سے بہتر کوئی بھی تشریح نہیں کر پایا ہے۔ سرمایہ (مارکس کے پورے معاشی نظام کی بنیاد) کی پہلی جلد کی تلخیص اوٹو روہلے نے بڑی احتیاط اور اپنے کام کی گہری سمجھ بوجھ کے ساتھ کی۔ سب سے پہلے تو فرسودہ مثالوں اور خاکوں کو حذف کرنا تھا اور پھر صرف تاریخی اہمیت کی حامل تحریروں سے لیے گئے اقتباسات کو، فراموش شدہ مصنفین کے ساتھ مناظروں اور آخر میں متعدد دستاویزات کو (پارلیمانی قوانین، فیکٹری معائنہ کاروں کی رپورٹیں وغیرہ) جن کی اہمیت ایک مخصوص عہد کو سمجھنے کے لیے ہوگی لیکن ایک مختصر توضیح، جو تاریخی سے زیادہ نظریاتی مقاصد رکھتی ہے، میں اُس کی کوئی جگہ نہیں۔ اس کے باوجود روہلے نے سائنسی تجزیے کی ترویج کے تسلسل اور توضیح کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ ہمیں یقین ہے کہ خیالات کی منطقی استخراج اور جدلیاتی حرکت میں کسی بھی مقام پر جھول نہیں آنے دیا گیا ہوگا۔ اس تلخیص کو توجہ اور غور سے نہ پڑھنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قاری کی مدد کے لیے اوٹو روہلے نے متن کے ساتھ مختصراً حاشیاتی عنوانات بھی فراہم کیے ہیں۔

نئے قاری کے لیے بالخصوص پہلے باب (جو سب سے مشکل ہے) میں مارکس کے بعض دلائل شاید متنازعہ، موشگافانہ یا ''مابعد الطبیعاتی'' لگیں۔ درحقیقت یہ تاثر عمومی مظاہر کو سائنسی انداز میں دیکھنے کی عادت کے فقدان کی وجہ سے اُبھرتا ہے۔ جنس (Commodity) ہماری روزمرہ زندگی میں اس حد تک پھیلی ہوئی اور عمومی چیز بن چکی ہے کہ ہم انجانے میں اس بات پر توجہ ہی نہیں دیتے کہ لوگ کیوں زندگی کے لیے لازمی اشیاء کو سونے یا چاندی کے چھوٹے سکوں کی خاطر چھوڑ دیتے ہیں جن کا کوئی دنیاوی استعمال ہی نہیں۔ معاملہ صرف جنس تک محدود نہیں ہے۔ منڈی کی معیشت کے تمام مقولات (بنیادی تصورات) کو بغیر کسی تجزیے کے قبول کرلیا جاتا ہے کہ جیسے وہ انسانی تعلقات

کی فطری بنیادیں ہوں۔ معاشی عوامل کے حقائق انسانی محنت، خام مال، اوزار، مشینیں، تقسیم محنت، تیار شدہ مال کو عمل محنت کے شرکا میں تقسیم کرنا وغیرہ ہیں جبکہ اجناس، روپے (money)، اجرتیں، سرمایہ، منافع، ٹیکس وغیرہ انسانوں کے ذہن میں معاشی عمل کے مختلف پہلوؤں (جنہیں وہ نہیں سمجھتے اور جو اُن کے کنٹرول میں نہیں ہے) سے برآمد شدہ نیم صوفیانہ خیالات ہیں۔ اُن کو سمجھنے کے لیے ایک جامع سائنسی تجزیے کی اشد ضرورت ہے۔

امریکہ میں (جہاں ایک ملین کے مالک آدمی کو ''ملین مین'' کہا جاتا ہے) منڈی کے نظریات کسی بھی دوسری جگہ کی نسبت زیادہ سرایت کر چکے ہیں۔ حالیہ دنوں تک امریکی معاشی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں زیادہ غور و فکر نہیں کرتے تھے۔ طاقتور ترین معاشی نظام کی سرزمین میں معاشی نظریے کو کم اہمیت دی جاتی تھی۔ امریکی معیشت کے حالیہ گہرے بحران نے رائے عامہ کو سرمایہ دارانہ سماج کے بنیادی مسائل سے بے رحمانہ انداز میں آشنا کر دیا ہے۔ بہر حال، جس نے بھی معاشی ارتقا کے پہلے سے تیار شدہ نظریات کو من و عن قبول کرنے کی عادت کو نہیں چھوڑا، جس کسی نے بھی، مارکس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، جنس کی بنیادی فطرت کو، سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی خلیہ نہیں جانا، وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے عہد کے اہم ترین مظاہر کو سائنسی انداز میں سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

مارکس کا طریقہ کار

فطرت کے معروضی واقعات کے ادراک کے لیے سائنس کو قائم کرنے کے بعد انسان نے سائنس سے سختی سے اپنے آپ کو مسلسل الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے لیے غیر مرئی قوتوں (مذہب) یا ابدی اخلاقی نظریات (خیال پرستی) سے تعامل کی شکل میں مخصوص جگہیں مراعات) بنانے کی کوشش کی ہے۔ مارکس نے انسان کو ان بیہودہ مراعات سے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لیے محروم کر کے اُسے مادی فطرت کے ارتقائی عمل کی ایک کڑی، انسانی سماج کو پیداوار اور تقسیم کی ایک تنظیم اور سرمایہ داری کو انسانی سماج کے ارتقا کا ایک مرحلہ قرار دیا۔

مارکس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ معیشت کے ''ابدی قوانین'' دریافت کرے۔ اس نے اس طرح کے قوانین کے وجود سے انکار کر دیا۔ انسانی سماج کے ارتقا کی تاریخ مختلف معاشی نظاموں کے تسلسل کی تاریخ ہے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی قوانین کے تابع تھی۔ ایک نظام سے دوسرے نظام تک عبور کا تعین ہمیشہ پیداواری قوتوں (تکنیک اور محنت کی تنظیم) کی ترقی سے ہوتا تھا۔ ایک خاص مرحلے تک سماجی تبدیلیاں اپنے کردار میں مقداری ہوتی ہیں اور سماج کی بنیادوں (رائج الوقت ملکیتی رشتے) کو تبدیل نہیں کرتیں۔ لیکن ایک ایسا مرحلہ آجاتا ہے جب ترقی یافتہ پیداواری قوتیں پرانے ملکیتی رشتوں میں سما نہیں سکتیں۔ پھر سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی اور بھونچال کا دور آتا ہے۔ غلام داری نے قدیم اشتمالی سماج کی جگہ لے لی۔ کسان غلامی مع جاگیر دارانہ بالائی ڈھانچے نے غلام داری کی جگہ لے لی، سولھویں صدی میں شہروں کی کاروباری ترقی نے یورپ کو سرمایہ داری سے متعارف کرایا جہاں سے یہ مختلف مراحل سے گزری۔ سرمایہ میں مارکس عمومی معیشت کی نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ معیشت کا مطالعہ کرتا ہے جس کے اپنے مخصوص قوانین ہوتے ہیں۔ صرف مختصراً وہ دوسرے معاشی نظاموں کا حوالہ دیتا ہے تاکہ سرمایہ داری کے کردار کو واضح کر سکے۔

قدیم کسان خاندان کی خودکفیل معیشت کو کسی 'سیاسی معیشت' کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک طرف سے یہ فطری قوتوں اور دوسری طرف سے روایات کی قوتوں کے تابع ہے۔ غلاموں کی محنت پر قائم یونانیوں اور رومنوں کی خودکفیل فطری معیشت غلام مالکوں کی مرضی سے چلتی تھی جن کے 'منصوبے' بجائے خود معمول اور فطرت کے قوانین سے متعین ہوتے تھے۔ یہی بات عہد وسطیٰ کی جاگیروں مع اپنے کسان غلاموں کے بارے میں بھی درست ہے۔ ان تمام مثالوں میں معاشی تعلقات اپنی قدیم سادگی کے ساتھ واضح اور شفاف تھے۔ لیکن موجودہ سماج کی کہانی یکسر مختلف ہے۔ اس نے قدیم بے نیاز رابطوں اور وراثت میں ملی محنت کی اشکال کو ختم کر دیا۔ نئے معاشی تعلقات نے شہروں اور دیہاتوں، صوبوں اور اقوام کو یکجا کر دیا۔ تقسیم محنت نے پورے سیارے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، روایات اور معمول کو کچلتے ہوئے ان تعلقات نے کسی مخصوص منصوبے کے تحت نہیں بلکہ انسانی شعور اور پیش بینی کے برعکس اپنی تشکیل کی اور ایسا لگتا ہے کہ انسان کے علم کے بغیر ہی ایسا ہوا۔ انسانوں، گروہوں، طبقوں اور اقوام کے ایک دوسرے پر انحصار (جو تقسیم محنت کا نتیجہ ہے) کو کوئی فرد منظّم نہیں کرتا۔ لوگ ایک دوسرے کو اور ایک دوسرے کی ضروریات کو جانے بغیر اس اُمید اور یقین کے ساتھ کام کرتے ہیں کہ اُن کے تعلقات کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو منظّم کریں گے اور حقیقت یہی ہے کہ ایسا ہی ہوتا تھا یا ہے۔

سرمایہ دارانہ سماج کے عوامل کی وجوہات کو موضوعی شعور (لوگوں کے ارادوں اور منصوبوں) میں تلاش کرنے کی کوشش قطعاً ناممکن ہے۔ سرمایہ داری کے عوامل سائنس کے اُس کے بارے میں سنجیدگی سے غور وفکر کرنے سے پہلے ہی وجود میں آ گئے تھے۔ آج تک لوگوں کی اکثریت سرمایہ دارانہ معیشت کو چلانے والے قوانین سے بے خبر ہیں۔ مارکس کے طریقہ کار کی تمام تر طاقت اس میں تھی کہ اُس نے معاشی مظاہر کو چند افراد کے موضوعی نکتہ نظر سے نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پورے سماج کی معروضی نکتہ نظر سے دیکھا۔ جس طرح ایک تجرباتی فطری سائنسدان شہد کی مکھی کے چھتے یا چیونٹیوں کے گھر کا مطالعہ کرتا ہے۔

معاشی سائنس میں فیصلہ کن اہمیت اس بات کی ہے کہ لوگ کیا اور کیسے کرتے ہیں نہ کہ وہ خود اپنے عمل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ سماج کی بنیاد مذہب یا اخلاقیات نہیں بلکہ فطرت اور محنت ہے۔ مارکس کا طریقہ کار مادہ پرستانہ ہے کیونکہ یہ وجود سے شعور کی طرف جاتی ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ مارکس کا طریقہ کار جدلیاتی ہے کیونکہ یہ فطرت اور سماج کے ارتقا اور بذات خود ارتقا کو برسر پیکار قوتوں کی باہمی چپقلش قرار دیتا ہے۔

مارکسزم اور سرکاری سائنس

مارکس کے اپنے پیشرو تھے۔ کلاسیکی سیاسی معاشیات (ایڈم سمتھ، ڈیوڈ ریکارڈو) سرمایہ داری کے بوڑھے ہو کر مستقبل سے ڈرنے سے قبل ہی اپنے عروج تک پہنچ چکی تھی۔ مارکس نے دونوں عظیم کلاسیکی شخصیات سے گہری عقیدت کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود کلاسیکی معیشت دانوں کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ سرمایہ داری کو سماج کے ارتقا کے ایک تاریخی مرحلے کی بجائے انسانوں کے معمول کی زندگی سمجھتے تھے۔ مارکس نے اس سیاسی معاشیات کی تنقید سے آغاز کرتے ہوئے اس کی غلطیوں اور سرمایہ داری کے اپنے تضادات کو واضح کیا اور دکھایا کہ اس

کا انہدام ناگزیر ہے۔ جس طرح روزا لکسمبرگ نے درست انداز میں کہا کہ مارکس کی معاشی تعلیمات کلاسیکی معاشیات کی اولاد ہیں، ایسی اولاد جس نے اپنی ماں کی جان لے لی۔

سائنس دانشوروں کے ہوا بند مطالعے میں نہیں بلکہ زندہ وجاوداں سماج میں اپنی منزل کو پہنچتی ہے۔ تمام تر مفادات اور جذبات، جو سماج کو چیر ڈالتے ہیں، سائنس (بالخصوص سیاسی معاشیات، دولت اور غربت کی سائنس) کے ارتقا پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے خلاف مزدوروں کی جدوجہد نے بورژوازی کے نظریہ دانوں کو مجبور کیا کہ وہ استحصالی نظام کے سائنسی تجزیے کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو معاشی حقائق کے محض تذکرے اور معاشیات کے ماضی کے مطالعے میں مصروف رکھیں۔ اس سے بھی زیادہ بدتر یہ کہ سرمایہ دارانہ حکومت کو جواز فراہم کرنے کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ سرکاری تعلیمی اداروں اور بورژوا پریس میں پڑھائے اور تبلیغ کئے جانے والے معاشی نظریات میں اہم معاشی حقیقی مواد کی کمی نہیں تاہم یہ معاشی عمل کو سمجھنے اور اس کے قوانین اور تناظر کو دریافت کرنے کے قطعاً قابل نہیں اور نہ ہی ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سرکاری سیاسی معاشیات مر چکی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج کا حقیقی علم صرف مارکس کے سرمایہ سے ہی مل سکتا ہے۔

قدر محنت کا قانون

موجودہ سماج میں انسانوں کا سب سے اہم رشتہ تبادلہ ہے۔ محنت کی کوئی بھی پیداوار جب تبادلے کے عمل میں داخل ہوتی ہے تو وہ جنس بن جاتی ہے۔ مارکس نے اپنے تجزیے کا آغاز جنس سے کیا اور سرمایہ دارانہ سماج کے اس بنیادی خلیے سے اُن سماجی رشتوں کو اخذ کیا جو انسانوں کی خواہشات سے آزاد تبادلے کی بنیاد پر اپنی تشکیل کرتے ہیں۔ صرف اسی راستے پر چل کر ہی اُس بنیادی معمے کو حل کیا جا سکتا ہے کہ بورژوا سماج میں، جہاں انسان صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور کوئی بھی دوسروں کے بارے میں نہیں سوچتا، کس طرح زندگی کے لیے لازم معیشت کی مختلف شاخوں کے اضافی تناسب تشکیل پاتے ہیں۔

مزدور اپنی قوت محنت بیچتا ہے، کسان اپنی پیداوار منڈی میں لے جاتا ہے، بینکار کے ساہوکار قرضے دیتے ہیں، پرچون فروش کے پاس مختلف اقسام کی اجناس ہوتی ہیں، صنعت کار پلانٹ لگاتے ہیں، سٹے باز سٹاک اور بانڈز کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ ہر کسی کو اپنی ترجیحات، ذاتی منصوبوں اور اجرتوں اور منافعوں کی فکر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان انفرادی کوششوں کے انتشار سے ایک مخصوص معاشی کُل ابھرتا ہے جو بلاشبہ ہم آہنگ نہیں بلکہ متضاد ہے لیکن سماج کو لازمآ نہ صرف زندہ رہنے بلکہ ترقی کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتشار ہرگز انتشار نہیں ہے بلکہ (اگر شعوری طور پر نہیں) کسی حد تک خود بخود منظّم ہوتا ہے۔ معیشت کے مختلف پہلوؤں کی آپس میں نسبتی توازن کی حرکیات کو سمجھنے کے لیے ہمیں سرمایہ داری کے معروضی قوانین کو دریافت کرنا ہوگا۔

واضح طور پر، سرمایہ دارانہ معیشت کے مختلف شعبوں (اجرت، قیمت، زمین، کرایہ، منافع، سود، قرض، سٹاک ایکسچینج) کو چلانے والے قوانین بے شمار اور پیچیدہ ہیں۔ لیکن آخری تجزیے میں وہ سب ایک ہی قانون پر منتج ہوتے ہیں جسے مارکس نے دریافت کر کے مکمل تجزیہ کیا

اور وہ ہے قدرِ محنت کا قانون، جو بلاشبہ سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی ریگولیٹر ہے۔ اس قانون کا جوہر سادہ ہے۔ سماج کے پاس زندہ قوت محنت کا ایک مخصوص ذخیرہ ہے۔ جب اس قوت کو فطرت پر لاگو کیا جاتا ہے تو انسانی ضروریات کی تسکین کے لیے لازمی پیداوار پیدا ہوتی ہے۔ آزاد پیداوار کنندگان کے بیچ تقسیم محنت کے نتیجے میں پیداوار اجناس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اجناس کا ایک خاص تناسب سے باہمی تبادلہ (پہلے بلاواسطہ اور بالآخر روپے یا سونے کے ذریعے) ہوتا ہے۔ اجناس کی بنیادی خاصیت، جو انہیں ایک خاص تعلق سے ایک دوسرے کے مساوی بنا دیتی ہے، اُن پر لگنے والی انسانی محنت ہے۔ تجریدی محنت، عمومی محنت جو تمام تر قدر کی بنیاد اور پیمائش ہے۔ لاکھوں منتشر پیداوار کنندگان کے درمیان تقسیم محنت سماج کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج نہیں ہوتی کیونکہ اجناس کا تبادلہ اُن پر صرف کیے گئے سماجی لازمی وقت محنت کے مطابق ہوتا ہے۔ اجناس کو قبول کر کے یا مسترد کر کے منڈی (جو تبادلے کی جگہ ہے) اُن کے اندر سماجی لازمی محنت کی موجودگی یا غیر موجودگی کا تعین کرتے ہوئے سماج کے لیے مختلف لازمی اجناس کے تناسب کا تعین کرتی ہے اور نتیجتاً مختلف پیشوں کے مطابق قوت محنت کی تقسیم کرتی ہے۔

منڈی کے اصل عوامل یہاں پر بیان کردہ چند سطروں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ پس قیمتیں قدر محنت کے گرد ڈولتے ہوئے اُس کے آس پاس ہی گھٹتی بڑھتی ہیں۔ اس اتار چڑھاؤ کی وجوہات کو مارکس نے سرمایہ کی تیسری جلد میں تفصیل سے بیان کیا ہے جو ''سرمایہ دارانہ پیداوار کے عمل کو کلی طور پر'' بیان کرتی ہے۔

انفرادی مثالوں میں اجناس کی قیمتوں اور قدروں میں فرق کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اس کے باوجود تمام قیمتوں کا حاصل جمع تمام قدروں کے حاصل جمع کے برابر ہوتا ہے کیونکہ آخری تجزیے میں انسانی محنت سے تخلیق کی گئی قدر ہی سماج کو ملتی ہے اور قیمتیں بشمول ٹرسٹوں کی اجارہ دارانہ قیمتیں ان حدود و قیود کو پار نہیں کر سکتیں۔ جہاں محنت نے کچھ پیدا نہ کیا ہو وہاں ''راک فیلر'' (Rockefeller) کو بھی کچھ نہیں مل سکتا۔

نابرابری اور استحصال

اگر اجناس کا آپس میں تبادلہ ان پر صرف کی گئی محنت کے مطابق ہوتا ہے تو برابری سے نابرابری کیسے جنم لیتی ہے؟ مارکس نے اس معمے کو اجناس میں سے ایک کی مخصوص فطرت کی وضاحت کرتے ہوئے حل کیا جو تمام تر دوسری اجناس کی بنیاد ہے، اور وہ ہے قوت محنت۔ ذرائع پیداوار کا مالک، سرمایہ دار، قوت محنت خریدتا ہے۔ تمام تر دوسری اجناس کی طرح اس کی قدر کی پیمائش اس پر خرچ کی گئی محنت کی مقدار سے کی جاتی ہے۔ یعنی وہ تمام ذرائع زندگی جو مزدور کے زندہ رہنے اور واپس کام پر آنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن اس جنس یعنی قوت محنت کے صرف ہونے کا مطلب کام یعنی قدر کی تخلیق ہے۔ ان نئی تخلیق کی گئی قدروں کی مقدار اُس سے بہت زیادہ ہے جو مزدور کو اس کام کے عوض ملتی ہے جسے وہ اپنی دیکھ بھال کے لیے خرچ کرتا ہے۔ سرمایہ دار قوت محنت کا استحصال کرنے کے لیے اُسے خریدتا ہے۔ یہی استحصال نابرابری کی بنیاد ہے۔

پیداوار کا وہ حصہ جو مزدور کے زندہ رہنے کے کام آتا ہے اسے مارکس لازمی پیداوار کہتا ہے اور اس سے زیادہ کی پیداوار کو زائد محصول (Surplus Product)۔ غلام کو زائد محصول لازماً پیدا کرنا ہو گا ورنہ غلام مالک غلام رکھے گا ہی نہیں۔ کسان غلام کو لازماً زائد محصول پیدا کرنا ہو گا ورنہ کسان غلامی زمیندار طبقے کے کسی کام کی نہیں۔ اسی طرح اجرتی مزدور بھی بہت بڑی مقدار میں زائد محصول پیدا کرتا ہے بصورت دیگر سرمایہ دار کو قوت محنت خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ طبقاتی جدوجہد زائد محصول کی جدوجہد کے علاوہ کچھ نہیں۔ جس کے پاس زائد محصول ہو گا وہی حالات کا مالک ہو گا۔ اُسی کے پاس دولت، ریاست، کلیسا، عدالتیں، سائنس اور آرٹ کی ملکیت ہو گی۔

مقابلہ بازی اور اجارہ داری

مزدوروں کا استحصال کرنے والے سرمایہ داروں کے درمیان تعلقات کا تعین مقابلہ بازی کرتی ہے جو ایک عرصے سے سرمایہ دارانہ ترقی کی کنجی ہے۔ بڑی بڑی فرموں کو چھوٹی فرموں پر تکنیکی، مالیاتی، تنظیمی، معاشی اور سب سے بڑھ کر سیاسی برتری حاصل ہے۔ سرمائے کی بڑی مقدار (یعنی مزدوروں کی بڑی تعداد کا استحصال کرنے کے قابل ہونا) ناگزیر طور پر مقابلے میں فتح یاب ہوتی ہے۔ سرمائے کا ارتکاز اور اس کی مرکزیت کا عمل اسی طرح ہی اٹل ہے۔

جہاں مقابلہ بازی تکنیک کی ترقی کا باعث بنتی ہے وہیں یہ نہ صرف درمیانی پرتوں بلکہ اپنے آپ کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے۔ مردہ اور نیم مردہ چھوٹے اور درمیانے درجے کے سرمایہ داروں پر ہمہ وقت عددی طور پر کم مگر طاقتور سرمایہ دار ابھرتے ہیں۔ اس طرح ''ایماندار''، ''جمہوری'' اور ''ترقی پذیر'' مقابلہ بازی سے قطعی خطرناک، طفیلی اور رجعتی اجارہ داری جنم لیتی ہے۔ پچھلی صدی کی اَسّی کی دہائی میں اجارہ داری نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا شروع کیا اور موجودہ صدی کے آغاز میں حتمی شکل اختیار کر لی۔ اب بورژوا سماج کے سرکاری نمائندوں کی اکثریت اجارہ داری کی فتح کو قبول کرتی ہے۔ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل ہومر ایس کمنگز نے شکایت کی ہے کہ روکنے والی قوت کے طور پر مقابلہ بازی کو بڑے شعبوں میں آہستہ آہستہ ہٹایا جا رہا ہے اور ماضی کے حالات کی صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ جبکہ مارکس نے اپنے تجزیے کے دوران سرمایہ داری کے اندرونی رجحانات سے اجارہ داری کو اخذ کیا۔ بورژوا دنیا مقابلہ بازی کو فطرت کے ابدی قانون کے طور پر دیکھتی ہے۔

اجارہ داری کے ذریعے مقابلہ بازی کا خاتمہ سرمایہ دارانہ سماج کی ٹوٹ پھوٹ کی علامت ہے۔ مقابلہ بازی سرمایہ داری کا اہم ترین تخلیقی حصہ اور سرمایہ داروں کا تاریخی جواز تھا۔ اسی وجہ سے ہی مقابلہ بازی کے خاتمے کا مطلب کھاتہ داروں کو سماجی طفیلیوں میں بدلنا ہے۔ مقابلہ بازی کو کچھ آزادیاں دینا پڑتی تھیں، آزاد فضا، جمہوری اور کاروباری عالم گیریت کی حکومت۔ اجارہ داری کے لیے حتی الامکان آمرانہ حکومت، محصولات، خام مال کے 'اپنے' ذرائع اور منڈی (نوآبادیات) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجارہ دارانہ سرمائے کی ٹوٹ پھوٹ کی آخری منزل فاشزم ہے۔

دولت کا ارتکاز اور طبقاتی تضادات کا ابھار

سرمایہ داروں اور اُن کے حواریوں کی ہر طرح سے یہ کوشش ہے کہ دولت کے ارتکاز کی حقیقی کیفیت کو لوگوں اور ٹیکس دہندگان کی آنکھوں سے اوجھل رکھے۔ بڑی ڈھٹائی سے بورژوا ذرائع ابلاغ اب بھی سرمایہ دارانہ سرمایہ کاری کی 'جمہوری' تقسیم کے فریب کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مارکسسٹوں کو رد کرتے ہوئے نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ تین سے پانچ ملین الگ آجر موجود ہیں۔ یہ درست ہے کہ جوائنٹ سٹاک کمپنیاں تین سے پانچ ملین آجروں کی نسبت دولت کے زیادہ ارتکاز کی غمازی کرتی ہیں لیکن امریکہ میں ''آدھ ملین کارپوریشنز'' بھی ہیں۔اوسط اعداد و شمار کو اس طرح پیش کرنے کا مقصد حقائق کو دکھانا نہیں بلکہ چھپانا ہے۔

جنگ کے آغاز سے لے کر 1923ء تک امریکہ میں پلانٹس اور فیکٹریوں کی تعداد انڈیکس عدد 100 سے 98.7 پر آ گئی جبکہ صنعتی پیداوار کی مقدار 100 سے 156.3 تک چلی گئی۔ ہیجان خیز ترقی کے ادوار (29-1923ء) کے دوران جب ایسا لگ رہا تھا کہ ہر کوئی امیر ہو رہا ہے، بڑی فرموں کی تعداد 100 سے 93.8 تک گر گئی جبکہ پیداوار 100 سے 113 ہو گئی۔لیکن کاروباری فرموں کا ارتکاز، اپنے بھاری بھرکم وجود کی وجہ سے، اپنی روحوں (ملکیت) کے ارتکاز سے بہت دور پیچھے ہے۔ 1929ء میں، جیسا کہ نیویارک ٹائمز درست طور پر مشاہدہ کرتا ہے، امریکہ میں واقعتاً تین لاکھ کارپوریشنز تھیں لیکن صرف یہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے 200 (کل تعداد کا 0.07 فیصد) براہ راست تمام کارپوریشنوں کے اثاثوں کا 49.2 فیصد کنٹرول کرتی تھیں۔ چار سال بعد یہ تناسب 56 فیصد اور روز ویلٹ کی انتظامیہ کے دنوں میں یہ مزید بڑھ گیا ہے۔ان دو سو سر فہرست کارپوریشنز میں اصل طاقت چھوٹی سی اقلیت کے پاس ہے۔ سینٹ کی ایک کمیٹی نے فروری 1937ء میں انکشاف کیا کہ پچھلے بیس سالوں میں بارہ سب سے بڑی کارپوریشنز کے فیصلے امریکی صنعت کے بڑے حصے کے لیے حکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کارپوریشنوں کے بورڈز کے چیئرمینوں کی تعداد امریکی صدر کی کابینہ (جمہوریہ کے حکومت کی انتظامی برانچ) کی تعداد کے برابر ہے۔لیکن بورڈ کے یہ چیئرمین کابینہ کے ممبران سے زیادہ طاقتور ہیں۔

یہی حال بینکنگ اور انشورنس کے نظام کا ہے۔ امریکہ میں پانچ بڑی انشورنس کمپنیوں نے نہ صرف دوسری کمپنیوں بلکہ بہت سے بینکوں کو بھی ہڑپ کر لیا ہے۔ بینکوں کی کل تعداد، بنیادی طور پر ادغام کی وجہ سے، نام نہاد انضمام کی شکل میں کم ہو گئی ہے۔ منافع میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ بینکوں کے اُوپر سُپر بینکوں کی اشرافیہ قائم ہوتی ہے۔ بینک کا سرمایہ صنعتی سرمائے کے ساتھ مل کر مالیاتی سُپر سرمائے کو تشکیل دیتا ہے۔ بالفرض صنعتوں اور بینکوں کے انضمام کی رفتار وہی ہو گی جو صدی کی پچھلی چوتھائی میں تھی (درحقیقت ارتکاز کی رفتار بڑھ رہی ہے) تو آنے والی چوتھائی صدی میں اجارہ داریاں بغیر کچھ چھوڑے ملک کی پوری معیشت کو ہتھیا لیں گی۔

یہاں پر امریکہ کے اعداد و شمار اس وجہ سے پیش کیے جا رہے ہیں کیونکہ وہ زیادہ درست اور قابل ذکر ہیں۔ بنیادی طور پر ارتکاز کا عمل اپنے کردار میں بین الاقوامی ہے۔ سرمایہ داری کے مختلف مرحلوں، اتفاقی حادثات کے ادوار، تمام سیاسی حکومتوں، پرامن اور مسلح جنگ کے ادوار میں دولت کے کم سے کم ہاتھوں میں ارتکاز کا عمل جاری ہے اور بغیر رُکے جاری رہے گا۔ جنگ عظیم کے سالوں کے دوران، جب اقوام

لڑتے لڑتے مر رہی تھیں، جب بورژوازی کی حکومتیں خود قومی قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں، جب مالیاتی نظام منہدم ہو کر مڈل کلاس کو بھی اپنے ساتھ غرق کر رہا تھا، اُس وقت بھی اجارہ داریاں اس خون خرابے سے بے نظیر منافع بٹور رہی تھیں۔ امریکہ کی طاقتور ترین کمپنیوں نے جنگ کے سالوں میں اپنے اثاثے دو، تین، چار اور پانچ گنا بڑھا دیئے اور اپنے منافعوں میں تین سو، چار سو، نو سو فیصد اور اس سے بھی زیادہ اضافہ کیا۔

1840ء میں، مارکس اور اینگلز کے کمیونسٹ مینی فیسٹو لکھنے سے آٹھ سال پہلے، مشہور فرانسیسی مصنف الیکسس ڈی ٹاکویلی نے اپنی کتاب ''امریکہ میں جمہوریت'' میں لکھا، ''بڑی دولت غائب ہوتی ہے، چھوٹی جائیدادیں بڑھتی ہیں۔'' اس سوچ کو متعدد مرتبہ دہرایا گیا، پہلے امریکہ کے حوالے سے اور پھر دوسری نوخیز جمہوریتوں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے حوالے سے۔ یقیناً ڈی ٹاکویلی کا یہ خیال اپنے عہد میں ہی ایک مغالطہ تھا۔ پھر بھی حقیقی ارتکاز دولت امریکی خانہ جنگی کے بعد، جس وقت ڈی ٹاکویلی مر گیا، شروع ہوا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں امریکہ کی دو فیصد آبادی کے پاس ملک کی مجموعی دولت کا آدھے سے زیادہ حصہ تھا۔ 1929ء میں اسی دو فیصد کے پاس قومی دولت کا تین چوتھائی حصہ تھا۔ اُسی وقت چھتیس ہزار خاندانوں کے پاس گیارہ ملین غریب اور متوسط طبقے کے خاندانوں کی آمدنی کے برابر دولت تھی۔ 1929-33ء کے بحران کے دوران اجارہ دارانہ فرموں کو عوامی خیرات کی اپیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے برعکس انہوں نے قومی معیشت کے عمومی بحران سے پہلے سے زیادہ کمایا۔ بعد میں نیوڈیل کے نتیجے میں ہونے والی کمزور صنعتی بحالی کے دوران اجارہ داروں نے خوب کمائی کی۔ بہترین حالات میں بیروزگاروں کی تعداد بیس ملین سے دس ملین ہوگئی۔ اس دوران سرمایہ دارانہ سماج کی اُوپری پرتوں نے (جن کی تعداد چھ ہزار سے زائد نہیں) حیرت انگیز منافع کمائے۔ اسی چیز کو سولیسٹر جنرل رابرٹ ایچ جیکسن نے بطور اینٹی ٹرسٹ اسسٹنٹ اٹارنی جنرل کے اپنی مدت ملازمت کے دوران اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کیا۔

فرڈیننڈ لنڈبرگ، جو اپنی تمام تر عالمانہ ایمانداری کے باوجود ایک قدامت پسند معیشت دان ہے، نے اپنی کتاب (جس سے کافی شور شرابا بھی ہوا) میں لکھا، ''امریکہ کی ملکیت ساٹھ امیر ترین خاندانوں کے پاس ہے، جن کی معاونت کم تر دولت کے حامل نوے خاندان کرتے ہیں۔'' اس میں تین سو پچاس خاندانوں کے دوسرے گروہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جن کی سالانہ آمدن ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ ہے۔ غالب حیثیت ساٹھ خاندانوں کے پہلے گروہ کی ہے جو نہ صرف منڈی بلکہ حکومت کے انتظام پر بھی قابض ہیں۔ اصلی حکومت یہی ہے، ''ڈالر جمہوریہ میں پیسے کی حکومت''۔

اس طرح سے ہمارے لیے ''اجارہ دارانہ سرمائے'' کے تجریدی خیال کو گوشت پوست سے مزیّن کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چند خاندان جو آپس میں خونی رشتوں اور مشترکہ مفادات کے ذریعے جڑ کر مخصوص سرمایہ دارانہ اشرافیہ بنا کر ایک عظیم قوم کی معاشی اور سیاسی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ارتکاز کے مارکسی قانون کی سچائی کو لازماً قبول کرنا ہی پڑے گا۔

کیا مارکس کی تعلیمات کا وقت گزر چکا ہے؟

مقابلہ بازی، ارتکازِ زر اور اجارہ داری کے سوالات فطری طور پر اس سوال کو جنم دیتے ہیں کہ کیا ہمارے عہد میں مارکس کا معاشی نظریہ صرف تاریخی اہمیت کا حامل ہے (جیسا کہ ایڈم سمتھ کا نظریہ) یا اس کی کوئی حقیقی اہمیت بھی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے معیار سادہ سا ہے، اگر نظریہ دوسرے نظریات کی نسبت بہتر انداز میں واقعات کا صحیح اندازہ لگاتا ہے اور مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہے تو قدیم ہونے سے قطع نظر وہ ہمارے عہد کا سب سے ترقی یافتہ نظریہ ہے۔

نامور جرمن معیشت دان ورنر سومبارٹ، جو اپنے کیریئر کے آغاز میں فی الواقع مارکسسٹ تھا لیکن بعد میں مارکس کی تعلیمات کے زیادہ انقلابی پہلوؤں، بالخصوص وہ جو بورژوازی کے لیے ناقابل ہضم تھے، میں ترمیم کی، نے 1928ء میں اپنے کیریئر کے اواخر میں مارکس کے 'سرمایہ' کو اپنی ''سرمایہ داری'' کے ذریعے رد کیا جس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں جو حالیہ دنوں میں بورژوا معیشت کے معذرت خواہوں کی بہترین طریقے سے ترجمانی کرتی ہے۔ سرمایہ کے مصنف کی تعلیمات کو افلاطونی حوصلہ افزائی کی عقیدت پیش کرنے کے بعد سومبارٹ اسی لمحے کہتا ہے، ''کارل مارکس نے اولاً اجرتی مزدوروں کی بڑھتی ہوئی بدحالی، ثانیاً دستکاروں اور کسان طبقے کے خاتمے کے نتیجے میں عمومی ارتکاز، ثالثاً سرمایہ داری کی تباہ کن بربادی کی پیش گوئی کی۔ ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔'' اس غلط تجزیے کے برعکس وہ اپنا ''مکمل سائنسی'' تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس کے مطابق، ''سرمایہ داری اپنے عروج کے دنوں میں اپنے آپ کو اندرونی طور پر اسی طرح تبدیل کرتی رہے گی جس طرح اس نے پہلے سے ہی اپنے آپ کو تبدیل کرنا شروع کیا ہے۔ جب یہ بوڑھا ہوگا تو یہ زیادہ سے زیادہ پرسکون، متین اور معقول ہوتا جائے گا۔'' ہم بنیادی نظریات کے بلبوتے پر تصدیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون درست ہے۔ تباہ کاری کے تجزیے والا مارکس یا سومبارٹ جو پوری بورژوا معیشت کے حوالے سے وعدہ کرتا ہے کہ معاملات پرسکون، متین اور معقول طریقے سے حل ہو جائیں گے۔ قاری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ سوال نہایت اہم ہے۔

بڑھتی ہوئی بدحالی کا نظریہ

سومبارٹ سے ساٹھ سال پہلے مارکس نے لکھا، ''دولت کا ارتکاز بیک وقت اُس طبقے، جو سرمائے کی شکل میں اپنی پیداوار پیدا کرتا ہے، کے لئے بدحالی، عذاب، غلامی، جہالت، وحشت، ذہنی رسوائی کا باعث بنتا ہے۔'' ''بڑھتی ہوئی بدحالی کا نظریہ'' کے نام سے مارکس کے اس نظریے کو جمہوری اور سوشل ڈیموکریٹک اصلاح پسندوں نے مسلسل حملوں کا نشانہ بنایا، بالخصوص 1896ء سے 1914ء کے دوران جب سرمایہ داری تیزی سے ترقی کرتے ہوئے مزدوروں، بالخصوص اُن کے بالائی حصوں کو، بعض مراعات دے رہی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد جب بورژوازی اپنے جرائم اور اکتوبر انقلاب سے خوفزدہ ہو کر تشہیری سماجی اصلاحات کی راہ پر چل نکلی، جس کے اثرات کو بیروزگاری اور افراط زر نے اسی وقت ہی ختم کر دیا، تو سرمایہ دارانہ سماج کے ترقی پسندانہ تبدیلی کے نظریے کو اصلاح پسندوں اور بورژوا پروفیسروں نے بالکل مستند سمجھا۔ 1928ء میں سومبارٹ نے یقین دلایا کہ ''اجرتی مزدوروں کی قوت خرید سرمایہ دارانہ پیداوار کے پھیلاؤ کے براہ راست تناسب سے بڑھ گئی ہے۔''

درحقیقت، سرمایہ دارانہ ترقی کے سب سے خوشحال ترین دور میں پرولتاریہ اور بورژوازی کے درمیان معاشی تضادات مزید گھمبیر ہو گئے۔ محنت کشوں کی مخصوص پرتوں کے معیارِ زندگی میں اضافے (جو اُس دوران بہت زیادہ تھا) نے قومی آمدن میں پرولتاریہ کے حصے میں کمی کو کمزور نظر لوگوں کی آنکھوں سے چھپا دیا۔ اس طرح زوال سے ذرا پہلے 1920ء اور 1930ء کے دوران امریکہ کی صنعتی پیداوار میں 50 فیصد کے حساب سے اضافہ ہوا جبکہ اجرتیں 30 فیصد کے حساب سے بڑھیں، جس کا مطلب سومبارٹ کی یقین دہانیوں کے باوجود قومی آمدن میں مزدوروں کا حصہ بے انتہا گھٹ گیا۔ 1930ء میں بیروزگاری میں بھیانک اضافہ ہوا اور 1933ء میں بیروزگاروں کو جو کم و بیش منظّم امداد دی جا رہی تھی وہ مشکل سے اس اجرت کا آدھا تھا جن سے اُنہیں ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ تمام طبقات کی ''ترقی'' کا فریب کوئی نشان چھوڑے بغیر ختم ہو چکا ہے۔ عوام کے معیارِ زندگی میں نسبتی زوال کی جگہ مطلق زوال نے لے لی ہے۔ محنت کشوں نے پہلے اپنی تفریح، پھر لباس اور آخر میں اپنی خوراک میں بھی کٹوتیاں شروع کر دی ہیں۔ اوسط معیار کی مصنوعات اور چیزوں کی جگہ غیر معیاری اور پھر غیر معیاری کی جگہ بدترین نے لے لی ہے۔ ٹریڈ یونین کی حالت اُس شخص کی طرح ہے جو برقی زینے پر چمٹے رہنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جب کہ برقی زینہ تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا ہے۔

دنیا کی چھ فیصد آبادی کے ساتھ امریکہ کے پاس دنیا کی دولت کا 40 فیصد ہے۔ جبکہ جس طرح روزویلٹ نے خود اعتراف کیا ہے کہ قوم کی ایک تہائی آبادی غذائی قلت، ناکافی لباس اور غیر انسانی حالات کا شکار ہے۔ پھر غریب ممالک کی کیا حالت ہوگی؟ پچھلی جنگ سے سرمایہ دارانہ دنیا کی تاریخ بڑھتی ہوئی بدحالی کے نظریے کو درست ثابت کرتی ہے۔ سماج میں بڑھتی ہوئی سماجی تفریق کو نہ صرف ہر لائق ماہر شماریات بلکہ ریاضی کے بنیادی قوانین کا علم رکھنے والے سیاست دان بھی قبول کرتے ہیں۔

فاشسٹ حکومت کسی بھی سامراجی سرمایہ داری کے اندر پوشیدہ زوال اور رجعت کی حدوں کو آخر تک لے جاتی ہے۔ سرمایہ داری کے زوال کی وجہ سے پرولتاریہ کے معیار زندگی میں اضافے کے فریب کو قائم نہ رکھنے کے نتیجے میں یہ ضروری ہو گیا تھا۔ فاشسٹ آمریت بڑھتی ہوئی غربت کے رجحان کا واضح اقرار ہے جسے سامراجی جمہوریتیں اب بھی چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مسولینی اور ہٹلر مارکسزم پر اس قدر نفرت سے جبر اس لیے کرتے ہیں کیونکہ اُن کی خوفناک حکومتیں بذات خود مارکسی تجزیے کو درست ثابت کرتی ہیں۔ مہذب دنیا اُس وقت برہم تھی یا برہمی کا ناٹک کر رہی تھی جب گورنگ نے اپنے مخصوص جلادی اور مسخرے کے انداز میں اعلان کیا کہ بندوق مکھن سے زیادہ اہم ہے یا جب مسولینی نے مزدوروں کو ہدایت کی کہ اپنی سیاہ قمیصوں پر مضبوطی سے پٹہ باندھنا سیکھ جائیں۔ لیکن درحقیقت کیا یہی چیزیں سامراجی جمہوریتوں میں نہیں ہوتی؟ مکھن کو ہر جگہ بندوق کو گریس کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ فرانس، انگلینڈ اور امریکہ کے مزدور سیاہ شرٹس کے بغیر ہی پٹہ باندھنا سیکھتے ہیں۔ دنیا کے امیر ترین ملک میں لاکھوں مزدور بھکاری بن کر، وفاقی، ریاستی، میونسپل یا نجی خیرات پر گزر بسر کر رہے ہیں۔

ریزرو فوج اور بیروزگاروں کا نیا ضمنی طبقہ

صنعتی ریزروفوج سرمایہ داری کی سماجی میکانیات کا اتنا ہی لازمی حصہ ہے جتنی کہ فیکٹری کے گوداموں میں خام مال اور مشینوں یا دکانوں میں مصنوعات کا ہوتا ہے۔ قوت محنت کے ذخیرے کے بغیر نہ تو پیداوار کی عمومی بڑھوتری اور نہ ہی سرمائے کے صنعتی چکر کی فصلی اتار چڑھاؤ سے مطابقت ممکن ہے۔ سرمایہ دارانہ ترقی کے عمومی رجحان، تغیر پذیر سرمائے (قوت محنت) کی قیمت پر مستقل سرمائے (مشینیں اور خام مال) میں اضافہ، سے مارکس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''سماجی دولت جتنی زیادہ ہوگی صنعتی ریزروفوج اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ زائد مجتمع آبادی جتنی زیادہ ہوگی سرکاری گداگری اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ یہی سرمایہ دارانہ ارتکاز کا مطلق قانون ہے۔''

یہ نظریہ (جو بڑھتی ہوئی بدحالی کے نظریے سے جڑا ہے اور جسے سالوں تک مبالغہ آرائی، متنازعہ اور جذباتی کہا گیا) اب چیزوں کی بے عیب نظریاتی تصویر بن چکا ہے۔ بیروزگاروں کی موجودہ فوج کو اب مزید ''ریزروفوج'' نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کی بنیادی تعداد کو روزگار ملنے کے امکانات بالکل نہیں۔ اس کے برعکس مزید بیروزگاروں کے مستقل بہاؤ سے اس کا حجم اور بڑھے گا۔ بکھرتی سرمایہ داری نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک پوری نسل پیدا کی ہے جنہیں کبھی روزگار ملا ہی نہیں اور نہ ہی ملنے کی امید ہے۔ پرولتاریہ اور نیم پرولتاریہ کے بیچ اس ضمنی طبقے کو سماج کے خرچے پر رہنا پڑتا ہے۔ اندازاً نو سال (1930-38ء) کے دوران بیروزگاری کی وجہ سے امریکی معیشت میں چار کروڑ تیس لاکھ انسانی سال (Man Year) ضائع ہوئے۔ فرض کریں کہ خوشحالی کے عروج 1929ء میں امریکہ میں بیروزگاروں کی تعداد بیس لاکھ تھی اور ان نو سالوں کے دوران امکانی مزدوروں کی تعداد میں پچاس لاکھ کا اضافہ ہوا تو ضائع شدہ انسانی سالوں کی تعداد بے نظیر حد تک بڑی ہوگی۔ اس طرح کا طاعون زدہ سماجی نظام اپنے بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ اس بیماری کی تشخیص اَسّی سال پہلے اس وقت ہوئی تھی جب خود بیماری صرف ایک جرثومے کی شکل میں تھی۔

متوسط طبقوں کا زوال

ارتکازِ سرمایہ کی نشاندہی کرنے والے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ متوسط طبقے کی پیداوار میں مخصوص اہمیت اور قومی آمدن میں حصہ مستقل انداز میں روبہ زوال ہے جب کہ چھوٹے کاروباروں کو بڑے کاروبار یا تو نگل رہے ہیں یا پھر زوال پذیر ہو کر اپنی آزادی گنوا رہے ہیں اور ناقابل برداشت مصیبتوں اور مایوسانہ افلاس کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ سرمایہ داری کی بڑھوتری نے فنی ماہرین، منیجر، سروس مین، کلرک، وکیل، فزیشنوں یا بیک لفظ نئے متوسط طبقوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے۔ لیکن یہ پرت، جس کا ابھار پہلے سے مارکس کے لیے کوئی معمہ نہیں تھا، پرانے مڈل کلاس سے بہت مختلف ہے جن کے پاس اپنی ذرائع پیداوار ہونے کی وجہ سے واضح معاشی آزادی تھی۔ ''نئی مڈل کلاس'' مزدوروں کی نسبت سرمایہ داروں پر زیادہ براہ راست طریقے سے منحصر ہے جو بڑی حد تک اس کا آقا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بیچ بھی بہت زیادہ زائد پیداوار دیکھی جا سکتی ہے جو سماجی ذلت پر منتج ہوتی ہے۔

اُوپر تذکرہ شدہ سابق اٹارنی جنرل ہومر کمنگز کی مانند مارکسزم سے لاعلم ایک شخص کہتا ہے، ''قابل بھروسہ اعداد و شمار دکھاتے ہیں کہ بہت سے صنعتی یونٹس مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں اور جو کچھ ہوا وہ امریکی زندگی سے چھوٹے کاروباروں کا بحیثیت عامل مسلسل خاتمہ ہے۔''

لیکن سومبارٹ اپنے پیشروؤں اور جانشینوں کے ساتھ مارکس کو نظرانداز کرتے ہوئے اعتراض کرتا ہے کہ ''دستکاروں اور کسان طبقے کے خاتمے کے ساتھ عمومی ارتکاز'' ابھی تک ہوا ہی نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس معاملے میں کون سی چیز زیادہ اہم ہے، غیر ذمہ داری یا بُرا عقیدہ۔ ہر نظریہ دان کی طرح مارکس نے بنیادی رجحانات کو اُن کی خالص شکل میں الگ کرکے اپنے کام کا آغاز کیا۔ ورنہ سرمایہ دارانہ سماج کی سرنوشت کو سمجھنا مکمل طور پر ناممکن ہوتا۔ مارکس خود بالکل اس قابل تھا کہ زندگی کے مظاہر کو ٹھوس تجزیے اور متنوع تاریخی عوامل کے ارتکاز کی روشنی میں دیکھے۔ یقیناً مختلف حالات کے تحت گرتی ہوئی اشیا کی رفتار کی شرح کے مختلف ہونے یا سیاروں کے مداروں میں خلل سے نیوٹن کے قوانین غلط ثابت نہیں ہوتے۔

متوسط طبقوں کی نام نہاد ''مضبوطی'' کو سمجھنے کے لیے اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دو رجحانات، متوسط طبقوں کی بربادی اور ان برباد شدگان کی پرولتاریہ میں تبدیلی نہ تو مستقل رفتار سے ہوتی ہے اور نہ ہی ایک اندازے سے۔ قوت محنت پر مشینوں کی برتری سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ متوسط طبقوں کی بربادی کے عمل کے آگے بڑھنے سے ان کی پرولتاریہ سازی کا عمل اتنا ہی پیچھے رہ جاتا ہے اور حتیٰ کہ ایک خاص موقع پر مؤخرالذکر کو مکمل طور پر رُک کر پلٹنا پڑتا ہے۔

جس طرح فزیالوجی کے قوانین کا عمل زندہ اور مرتے ہوئے اجسام میں مختلف نتائج دیتا ہے اسی طرح مارکسی معیشت کے قوانین ترقی پذیر اور بکھرتی ہوئی سرمایہ داری میں مختلف انداز میں لاگو ہوتے ہیں۔ اس فرق کو قصبوں اور دیہاتوں کے باہمی تعلق میں خاص طور پر واضح دیکھا جاسکتا ہے۔ 1910ء تک امریکہ کی دیہی آبادی (مجموعی آبادی کی نسبت کم بڑھی) مطلق عدد میں بڑھتی رہی، جب یہ تین کروڑ بیس لاکھ کو پہنچی۔ اگلے بیس سالوں میں ملک کی مجموعی آبادی میں اضافے سے قطع نظر، یہ تین کروڑ چار لاکھ تک گری یعنی سولہ لاکھ۔ لیکن 1935ء میں 1930ء کی نسبت چوبیس لاکھ بڑھ کر دوبارہ تین کروڑ اٹھائیس لاکھ تک پہنچی۔ اس طرح کی ظاہراً حیران کن تبدیلی کسی طرح بھی شہری آبادی کی دیہی آبادی کی قیمت پر بڑھنے کا رجحان یا متوسط طبقے کے سکڑنے کے رجحان کو رد نہیں کرتی۔ اس کے باوجود یہ بحیثیت مجموعی سرمایہ دارانہ نظام کی ٹوٹ پھوٹ کو واضح دکھاتی ہے۔ 35-1930ء کے گہرے بحران کے دوران دیہی آبادی میں اضافے کو اس سادہ حقیقت سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ تقریباً بیس لاکھ شہری آبادی یا زیادہ واضح انداز میں بیس لاکھ بھوکے بیروزگار دیہاتوں کی طرف ہجرت کر گئے تاکہ کسانوں کی ترک کی ہوئی زمینوں یا اپنے رشتہ داروں کے کھیتوں پر اپنی قوت محنت کو (جسے سماج نے دھتکارا تھا) پیداواری فطری معیشت پر لگا کر مکمل بھوک سے مرنے کی بجائے نیم فاقے کی زندگی تو گزار سکیں۔

پس، یہ چھوٹے کسانوں، دستکاروں یا پرچون فروشوں کے استحکام کا سوال نہیں بلکہ اُن کے حالات زندگی کی مکمل بے بسی کی علامت ہے۔ مستقبل کی ضمانت کی بجائے مڈل کلاس ماضی کی بدقسمت اور پُر الم باقیات ہیں۔ مکمل طور پر ختم نہ کرسکنے کی وجہ سے سرمایہ داری نے اسے ذلت اور تنگ دستی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچا دیا ہے۔ کسان کو نہ تو اس کی زمین کا کرایہ دیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے لگائے گئے سرمائے پر منافع دیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی اجرت کا بڑا حصہ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس طرح قصبوں میں چھوٹے دکاندار زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ مڈل کلاس اس لیے پرولتاریہ نہیں بنتے کیونکہ وہ دربدر ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے مارکس کے خلاف دلیل ڈھونڈنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا

کہ سرمایہ داری کے حق میں دلیل ڈھونڈنا۔

صنعتی بحران

گزشتہ صدی کے اختتام اور نئی صدی کے آغاز میں سرمایہ داری نے اتنی زبردست ترقی کی ہے کہ دوری بحرانات کی حیثیت اتفاقی ایذا رسانی سے زیادہ کچھ نہیں۔ آفاقی سرمایہ دارانہ رجائیت کے سالوں میں مارکس کے نقادہمیں یقین دلاتے تھے کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ٹرسٹوں، سنڈیکیٹس، کارٹلز کے ابھار نے منڈی کے منصوبہ بند کنٹرول کو متعارف کرا دیا اور بحرانوں پر آخری فتح کی نوید سنائی۔ سومبارٹ کے مطابق بحرانات کو جنگ سے پہلے ہی سرمایہ داری کے ماہرین نے اس طرح سے ختم کر دیا ہے کہ ''آج ہمیں بحران کے مسئلے کی کوئی پرواہ ہی نہیں۔'' آج دس سال بعد یہ الفاظ کھوکھلے مسخرے لگتے ہیں جبکہ ہمارے عہد میں ہی مارکس کا تجزیہ اپنی المناک معقولیت کی پوری آب و تاب لیے ہمارے سامنے ہے۔ زہریلے خون والے جسم میں ہر بیماری عذاب مسلسل بن جاتی ہے۔ اسی طرح اجارہ دارانہ سرمایہ داری کے بوسیدہ جسم میں بحرانات ایک مہلک بیماری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سرمایہ دارانہ ذرائع ابلاغ، جو اجارہ داریوں کے وجود سے ہی منکر ہیں، انہی اجارہ داریوں پر تکیہ کر کے سرمایہ دارانہ انتشار سے انکار کرتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز طنزیہ انداز میں کہتا ہے، ''اگر ساٹھ خاندانوں کو امریکہ کی معاشی زندگی کو کنٹرول کرنا ہو تو اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ امریکی سرمایہ داری کو غیر منصوبہ بندی کے برعکس انتہائی مہارت سے منظّم کیا جاتا ہے۔'' لیکن اس دلیل کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔

سرمایہ داری اپنے رجحانات میں سے کسی کو بھی آخر تک نہیں لے جا سکی۔ جس طرح دولت کا ارتکاز مڈل کلاس کو ختم نہیں کرتا اسی طرح اجارہ داری مقابلہ بازی کو ختم نہیں کرتی بلکہ صرف اُسے زیر کر کے نقصان پہنچاتی ہے۔ ساٹھ خاندانوں میں سے ہر ایک کے منصوبے کی طرح ان عام منصوبوں کی مختلف اقسام کا مقصد بھی معیشت کی مختلف شاخوں کو جوڑنا نہیں بلکہ دوسرے اجارہ دارانہ گروہوں اور پوری قوم کی قیمت پر اپنے اجارہ دارانہ ٹولے کے منافعوں میں اضافہ کرنا ہے۔ آخری تجزیے میں ان منصوبوں کے ٹکراؤ سے قومی معیشت کا انتشار اور گہرا ہوتا جائے گا۔ اجارہ دارانہ آمریت اور انتشار الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کی تشکیل کرتی اور پروان چڑھاتی ہیں۔

امریکہ میں **1929**ء کا بحران سومبارٹ کے اس دعوے کے ایک سال بعد رونما ہوا جس میں اس نے کہا کہ اُس کی ''سائنس'' بحرانات کے مسئلے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ بے نظیر خوشحالی کے عروج سے امریکی معیشت کو بھیانک بربادی کی اتھاہ گہرائیوں میں جھونک دیا گیا۔ مارکس کے زمانے میں اس طرح کی وسیع اُتھل پتھل کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ امریکہ کی قومی آمدن **1920**ء میں پہلی بار **69** ارب ڈالر پر پہنچ کر اگلے سال ہی **27** فیصد گراوٹ کے ساتھ **50** ارب ڈالر ہو گئی۔ اگلے چند سالوں کی ترقی کے نتیجے میں قومی آمدن دوبارہ بڑھی اور **1929**ء میں اپنی بلند ترین سطح **81** ارب ڈالر پر پہنچنے کے بعد **1932**ء میں آدھے سے زیادہ گھٹ کر **40** ارب ڈالر ہو گئی۔ **1930-38**ء کے دوران قومی آمدن کے تقریباً **133** ارب ڈالر اور محنت کے چار کروڑ تیس لاکھ انسانی سال ضائع ہو گئے۔ یہ **1929**ء

کی آمدن اور محنت کے حالات تھے جب ''صرف'' دو ملین بیروزگار تھے۔ اگر یہ انتشار نہیں ہے تو اس لفظ کا ممکنہ طور پر مطلب کیا ہے؟

انہدام کا نظریہ

مڈل کلاس دانشوروں اور ٹریڈ یونین کی افسر شاہی کے دل و دماغ کو مارکس کی موت اور جنگ کے آغاز کے درمیانی عرصے میں سرمایہ داری کی حاصلات نے موہ لیا تھا۔ مرحلہ وار ترقی (ارتقا) کے نظریے پر ہمیشہ کے لیے مہر تصدیق ثبت ہو چکی تھی جبکہ انقلاب کا نظریہ بربریت کے عہد کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ارتکازِ زر، طبقاتی تضادات میں اضافہ، بحرانات کی شدت اور سرمایہ داری کے تباہ کن انہدام کے بارے میں مارکس کے تجزیے میں تھوڑی بہت تصحیح کر کے ترمیم یا جامع نہیں بنایا گیا بلکہ قومی آمدنی کی زیادہ متوازن تقسیم، طبقاتی تضادات میں کمی اور سرمایہ دارانہ سماج کی بتدریج اصلاح کے معیاری طور پر متضاد تجزیے پیش کر کے اُسے مسترد کر دیا۔ جین جوریز، کلاسیکی عہد کا سب سے قابل سوشل ڈیموکریٹ، کو اُمید تھی کہ سیاسی جمہوریت میں بتدریج سماجی مواد بھر دیا جائے گا۔ یہی اصلاح پسندی کی روح ہے۔ یہ متبادل تجزیہ تھا۔ اب کیا بچا ہے؟

ہمارے عہد میں اجارہ دارانہ سرمایہ داری بحرانوں کی ایک زنجیر ہے۔ ہر بحران ایک تباہ کاری ہے۔ محصولاتی دیواریں کھڑی کر کے، افراط زر، حکومتی اخراجات اور قرضے بڑھا کر ان جزوی تباہ کاریوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش اضافی، گہرے اور مزید وسیع بحرانوں کی راہ ہموار کرنا ہے۔ منڈیوں، خام مال اور نو آبادیات کی جدوجہد فوجی تباہ کاریوں کو ناگزیر بناتی ہے اور مجموعی طور پر یہ انقلابی تبدیلیوں کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ سومبارٹ کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ سرمایہ داری بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ مزید پرسکون، پرامن اور بہتر ہوتی جائے گی۔ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یہ دلیل کی آخری باقیات سے ہاتھ دھو رہی ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ''انہدام کا نظریہ'' پرامن ترقی کے نظریے پر سبقت لے گیا ہے۔

سرمایہ داری کا انحطاط

منڈی کا تسلط سماج کو بہت مہنگا پڑا ہے تاہم ایک مخصوص عہد تقریباً جنگِ عظیم تک انسانوں نے جزوی اور عمومی بحرانوں کے باوجود خوب ترقی کی اور مالا مال ہوئے۔ اُس دور میں ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت نسبتاً ترقی پسندانہ عامل تھا۔ لیکن اب قدر کے قانون کا اندھا تسلط مزید یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکتا۔ انسانی سماج کا ارتقا بند گلی میں پھنس چکا ہے۔ تازہ ترین تکنیکی کامیابیوں کے باوجود مادی پیداواری قوتیں مزید ترقی نہیں کر پا رہیں۔ زوال کی سب سے بے عیب اور واضح نشانی یہ ہے کہ معیشت کی بنیادی شاخوں میں نئی سرمایہ کاری کے رُکنے کی وجہ سے عالمی سطح پر تعمیراتی صنعت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ سرمایہ داروں کو اب اپنے نظام کے مستقبل پر مزید کوئی اعتبار نہیں۔ حکومتی سطح پر تعمیرات کو بڑھاوا دینے کا مطلب ٹیکسوں میں اضافہ اور ''بے پناہ'' قومی آمدن کا سکڑاؤ ہے کیونکہ نئی حکومتی تعمیرات کا بڑا حصہ براہ راست جنگی مقاصد کے لیے ہے۔

زراعت، انسانی سرگرمیوں کا سب سے قدیم شعبہ اور حیات آفریں بنیادی انسانی ضروریات سے قریبی طور پر جڑا ہوا، میں سوکھا روگ نے خاص طور پر بھیانک اور ذلت آمیز شکل اختیار کر لی ہے۔ ذاتی ملکیت کی سب سے رجعتی شکل یعنی چھوٹی زمینداری کی زراعت کے راستے میں رکاوٹ سرمایہ دارانہ حکومتوں کو مزید تسکین فراہم نہیں کرتیں۔ وہ قانونی اور انتظامی اقدامات کے ذریعے پیداوار کو مصنوعی طور پر کم کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں جو گلڈز کے دستکاروں کو اپنے زوال کے عہد میں خوفزدہ کر دیتیں۔ یہ بات تاریخ میں لکھی جائے گی کہ طاقتور ترین سرمایہ دارانہ حکومت پیداوار کو کم کرنے (یعنی پہلے سے کم ہوتی ہوئی قومی آمدن کو مصنوعی طور پر کم کرنا) کے لیے اپنے کسانوں کو انعامات دیتی ہے۔ نتائج خود عیاں ہیں۔ تجربات اور سائنس کے بلبوتے پر حاصل کردہ پرشکوہ پیداواری امکانات کے باوجود سڑتے ہوئے بحران سے نکل نہیں پا رہی۔ جب کہ انسانوں کی اکثریت پر مبنی بھوکے لوگوں کی تعداد میں اضافہ سیارے کی آبادی میں اضافے سے زیادہ ہے۔ رجعتی لوگ اس طرح کی تباہ کن پاگل پن پر مبنی سماجی نظام کے دفاع کو دانشمندانہ سیاست کا نام دیتے ہیں جب کہ اس طرح کے پاگل پن کے خلاف سوشلسٹ جدوجہد کو تباہ کن خیالی پلاؤ کہہ کر مذمت کرتے ہیں۔

فاشزم اور نیا معاہدہ (New Deal)

انتہاسک روپ سے برباد سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کے لیے دو طریقے اپنی تمام تر شکلوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فاشزم اور نیوڈیل۔ پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کو دوبارہ ابھرنے سے روکنے کے لیے فاشزم اپنے پروگرام کی بنیاد مزدور تنظیموں کے خاتمے، سماجی اصلاحات کی بربادی اور جمہوری حقوق کے مکمل خاتمے پر رکھتی ہے۔ فاشزم ''قوم'' اور ''نسل'' (بے باکانہ نام جن کے نیچے سڑتی ہوئی سرمایہ داری چھپی ہے) کو بچانے کے نام پر مزدوروں کی تنزلی اور مڈل کلاس کی بربادی کو سرکاری طور پر قانونی شکل دے دیتی ہے۔

نیوڈیل کی حکمت عملی، جو مزدور اور کسان اشرافیہ کو رشوت دے کر سامراجی جمہوریت کو بچانا چاہتی ہے، صرف دولت مند قوموں کے لیے ہے اور اس حوالے سے یہ بہترین امریکی پالیسی ہے۔ حکومت نے اس پالیسی کے اخراجات کا کچھ حصہ اجارہ داریوں کے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔ انہیں اجرتوں میں اضافے اور اوقات کار میں کمی کا کہہ رہے ہیں تا کہ آبادی کی قوت خرید بڑھے اور پیداوار میں اضافہ ہو۔ لیون بلوم نے اس خطبے کو فرانس میں لاگو کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ امریکیوں کی طرح فرانسیسی سرمایہ دار بھی پیداوار کے لیے نہیں بلکہ منافع کے لیے پیدا کرتے ہیں۔ وہ پیداوار کو کم کرنے حتیٰ کہ تیار مصنوعات کو تباہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں بشرطیکہ قومی آمدنی میں اس کا حصہ بڑھے۔

نیوڈیل پروگرام اس حوالے سے بھی غیر موافق ہے کہ ایک طرف سرمائے کے مگرمچھوں کو افراط کی قلت پر برتری کے فوائد کے بارے میں وعظ دیئے جاتے ہیں جبکہ دوسری طرف حکومت پیداوار کو کم کرنے کے لیے انعامات دے رہی ہے۔ کیا اس سے زیادہ بوکھلاہٹ ممکن ہے؟ حکومت اپنے ناقدین کو اس چنوتی سے لاجواب کرتی ہے، ''کیا آپ کے پاس کوئی بہتر حل ہے؟'' ان سب کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ

داری کی بنیاد پر حالات مایوس کن ہیں۔
1933ء سے پچھلے سات سالوں میں وفاقی، صوبائی اور مقامی حکومتوں نے بیروزگاروں کو 15 ارب ڈالر دیئے ہیں۔ختم شدہ اجرتوں کو مدنظر رکھا جائے تو یہ اُس کا بہت قلیل حصہ ہے لیکن گرتی ہوئی قومی آمدن کے حوالے سے یہ بہت بڑی رقم ہے۔1938ء کے دوران، جو نسبتاً معاشی بحالی کا سال تھا، امریکہ کا قومی قرضہ دو ارب ڈالر بڑھ کر 38 ارب ڈالر سے گزر گیا یا عالمی جنگ کے اختتام پر بلند ترین سطح سے 12 ارب ڈالر زیادہ۔1939ء کے آغاز میں یہ 40 ارب ڈالر سے گزر گیا۔اور پھر کیا ہوا؟ بڑھتا ہوا قومی قرضہ ترقی پر بوجھ ہے۔لیکن نیوڈیل ماضی کی نسلوں کی جمع کی ہوئی بے پناہ دولت کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی۔ایک امیر ملک ہی اس طرح کی مہنگی پالیسی کو برداشت کرسکتا ہے۔ لیکن اس طرح کا ملک بھی غیر معینہ مدت تک ماضی کی نسلوں کے خرچے پر نہیں رہ سکتی۔ نیوڈیل کی پالیسی اپنی مصنوعی حاصلات اور قومی قرضوں میں حقیقی اضافے کے ساتھ ناگزیر طور پر خطرناک سرمایہ دارانہ رجعت اور سامراجیت کے تباہ کن ابھار کو جنم دے گی۔ دوسرے الفاظ میں یہ فاشزم کی پالیسی کے راستے پر ہی چل رہی ہے۔

بے قاعدگی یا معمول؟

وزیرِ داخلہ ہیرولڈ اِکس سمجھتا ہے کہ یہ ’’پوری تاریخ کی سب سے عجیب بے قاعدگیوں میں سے ایک ہے‘‘ کہ امریکہ ظاہری طور پر جمہوری اور اندر سے آمرانہ ہے۔’’اکثریت کی حکومت کی سرزمین امریکہ کو کم از کم 1933ء تک اجارہ داریاں چلاتی تھیں جن کو پھر اُن کے نہایت ہی قلیل کھاتہ دار چلاتے ہیں۔‘‘ تجزیہ درست ہے لیکن اس اطلاع کی استثنٰی کے ساتھ کہ روزویلٹ کے آنے کے بعد اجارہ داریوں کی حکومت یا تو ختم ہوئی یا کمزور ہوئی۔لیکن اِکس جسے ’’پوری تاریخ کی سب سے عجیب بے قاعدگیوں میں سے ایک‘‘ کہتا ہے وہ درحقیقت سرمایہ داری کی ایک مسلمہ روایت ہے۔کمزور پر طاقتور، زیادہ پر کم اور محنت کشوں پر استحصال کنندگان کی حکومت بورژوا جمہوریت کا بنیادی قانون ہے۔جو چیز امریکہ کو دوسرے ممالک سے ممتاز کرتی ہے وہ محض اس کی سرمایہ داری کی زیادہ وسعت اور اس کے تضادات کی زیادہ ہولناکیت ہے۔جاگیردارانہ ماضی کا فقدان، بے پناہ وسائل، پرجوش اور تخلیقی لوگ، بیک لفظ جمہوریت کی مسلسل ترویج کے لیے تمام لازمی شرائط نے درحقیقت شاندار ارتکازِ زر کو ممکن بنایا ہے۔
اب اِکس اجارہ داریوں کے خلاف فتح تک جنگ لڑنے کا وعدہ کرتے ہوئے فرینکلن روزویلٹ کے پیشرووٴں تھامسن جیفرسن، اینڈریو جیکسن، ابراہم لنکن، تھیوڈور روزویلٹ اور ووڈرو ولسن کو بے ساختہ یاد کرتا ہے۔30 دسمبر 1937ء کو اُس نے کہا، ’’عملی طور پر ہماری تمام تاریخی شخصیات دولت اور طاقت کی چند ہاتھوں میں حد سے زیادہ ارتکاز کو انتھک اور جرأت مندی سے لڑ کر روکنے اور کنٹرول کرنے کے لیے مشہور ہیں۔‘‘ لیکن ان باتوں کے بعد یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس ’’انتھک اور جرأت مندانہ جدوجہد‘‘ کا ثمر جمہوریت پر دھن راج کا مکمل غلبہ ہے۔
کسی ناقابل بیان وجہ سے اِکس کو اس دفعہ فتح کا یقین ہے۔شرط یہ ہے کہ لوگ اس بات پر باور کریں کہ جنگ ’’نیوڈیل اور اوسط روشن خیال

کاروباریوں کے درمیان نہیں بلکہ نیوڈیل اور ساٹھ خاندانوں کی بادشاہت کے بیچ ہے جنہوں نے امریکہ کے باقی کاروباریوں کو اپنی حاکمیت سے خوفزدہ کیا ہے۔'' یہ حاکمانہ ترجمان یہ نہیں بتاتا کہ جمہوریت اور ''عظیم تاریخی شخصیات'' کی کوششوں کے باوجود آخر کس طرح ان قدامت پسندوں نے تمام روشن خیال کاروباریوں کو مطیع بنایا ہے۔ راک فیلرز، مورگنز، میلنز، وینڈربلٹز، گگن ہیمز، فورڈز اینڈ کمپنی نے امریکہ پر باہر سے حملہ نہیں کیا، جس طرح کورٹیز نے میکسیکو پر حملہ کیا تھا۔ وہ ''لوگوں'' میں سے ہی ابھرے یا درست انداز میں ''روشن خیال صنعت کاروں اور کاروباریوں'' کے طبقے سے ابھرے اور مارکس کے تجزیے کی روح کے مطابق سرمایہ داری کی فطری اوج پر پہنچ گئے۔ اپنے عروج کے دنوں میں جب ایک نوخیز اور طاقتور جمہوریت دولت کے ارتکاز کو (جب وہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھی) نہیں روک سکی تو کیا اس بات پر صرف ایک لمحے کے لیے بھی یقین کیا جاسکتا ہے کہ ایک سڑتی ہوئی جمہوریت اپنی آخری حدوں کو چھوتی ہوئی طبقاتی کشمکش کو کمزور کر سکے؟ بہر حال، نیوڈیل کے تجربات سے اس بات کی قطعاً کوئی امید نہیں۔ حکومت کے خلاف بڑے کاروباروں کے الزامات کو مسترد کرتے ہوئے انتظامی کونسل کی ایک بڑی شخصیت رابرٹ جیکسن نے اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کیا کہ روز ویلٹ کے دور میں سرمائے کے مگرمچھوں کے منافعوں میں اتنا اضافہ ہوا کہ ہُوور کے سابقہ دورِ صدارت میں وہ اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بہر حال اس سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ اجارہ داریوں کے خلاف روز ویلٹ کی جدوجہد کو اپنے پیشرووٴں سے زیادہ کامیابی نہیں ملی۔

اگرچہ اصلاح پسند سرمایہ داری کی بنیادوں کا دفاع کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن وہ فطری طور پر قوانین میں سخت معاشی اقدامات کا اضافہ کرنے میں بے بس ہیں۔ وہ نصیحت کرنے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ نیوڈیل کے مبلغین اور کابینہ کے دوسرے ارکان کی طرح اِکس اپنی بات اجارہ داریوں سے گزارش کے ذریعے ختم کرتا ہے کہ وہ شائستگی اور جمہوری اُصولوں کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ کیا یہ بارش کے لیے دُعا کی مانند نہیں ہے؟ یقیناً مارکس کا ذرائع پیداوار کے ملکیت کا نظریہ زیادہ سائنسی ہے۔ سرمایہ میں ہم پڑھتے ہیں، ''بحیثیت سرمایہ دار وہ محض مجسم سرمایہ ہے۔ اُس کی روح سرمائے کی روح ہے۔ لیکن سرمائے کا زندگی میں صرف ایک ہی مقصد ہے، قدرِ زائد پیدا کرنا۔'' اگر سرمایہ دار کے رویے کا تعین اس کی انفرادی روح کی خصلتیں یا وزیر داخلہ کی جذباتی باتیں کریں پھر نہ تو اوسط قیمتیں نہ اوسط اجرتیں، نہ کھاتوں اور نہ ہی پوری سرمایہ دارانہ معیشت کا وجود ہوتا۔ تاہم کھاتہ داری فروغ پا رہی ہے اور تاریخ کے مادی نظریے کے حق میں ایک مضبوط دلیل ہے۔

عدالتی نیم حکیمی

امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل ہومر کمنگز نے نومبر 1937ء میں کہا، ''جب تک ہم اجارہ داری کو ختم نہیں کریں گے، اجارہ داری مختلف طریقوں سے ہماری زیادہ تر اصلاحات کا خاتمہ کرے گی اور بالآخر ہمارے عمومی معیارِ زندگی کو نیچے لے جائے گی۔'' حیران کن اعداد و شمار پیش کر کے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ، ''دولت اور معاشی کنٹرول کے ناجائز ارتکاز کا رجحان صریح تھا۔'' اس کے باوجود کمنگز نے مجبوراً اعتراف کیا کہ اب تک ٹرسٹوں کے خلاف قانونی اور عدالتی جنگ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ شکایت کرتا ہے، ''ایک منحوس ارادے کا پتہ

لگانا مشکل ہے کیونکہ یہ معاشی نتائج کا مسئلہ ہے۔'' یہی تو بات ہے! اس سے بدتر یہ کہ ''ٹرسٹوں کے خلاف عدالتی جنگ نے معاملات کو مزید بگاڑ دیا ہے۔'' مارکسی قانون قدر کے خلاف جمہوری انصاف کی جنگ کی بے بسی کو یہ خوش کن تکرار بڑی خوبی سے واضح کرتا ہے۔ اس بات کی کوئی امید نہیں کہ کمنگز کے جانشین فرینک مورفی ان مسائل کو حل کرے گا جن کا صرف ذکر ہی معاشی نظریات کے میدان میں قنوطی نیم حکیمی کو سامنے لاتا ہے۔

ماضی کی طرف واپسی

پروفیسر لیوس ڈگلس، روزویلٹ انتظامیہ میں سابقہ بجٹ ڈائریکٹر، سے ہمیں اتفاق کرنا چاہیے جب وہ حکومت کی اس بات پر مذمت کرتا ہے کہ وہ ''ایک شعبے میں اجارہ داری پر حملے کرتی ہے جبکہ دوسرے بہت سے شعبوں میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔'' تاہم فطری طور پر اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔ مارکس کے مطابق، حکومت حکمران طبقے کی انتظامی کمیٹی ہے۔
آج اجارہ داریاں حکمران طبقے کا سب سے مضبوط دھڑا ہیں۔ حکومت کسی بھی طرح اجارہ داری کے خلاف (اُس طبقے کے خلاف جن کی مہربانی سے وہ حکومت میں ہیں) نہیں لڑسکتی۔ اجارہ داری کے ایک حصے پر حملہ کر کے وہ دوسرے حصے میں اتحادی تلاش کرنے پر مجبور ہیں۔ بینکوں اور چھوٹی صنعتوں کے ساتھ مل کر یہ بھاری صنعتوں کی ٹرسٹوں پر کبھی کبھار حملے کرتے ہیں لیکن وہ ان کی پرواہ کئے بغیر بڑے منافع کما رہے ہیں۔
لیوس ڈگلس سرکاری نیم حکیمی کے مقابلے میں سائنس نہیں بلکہ دوسری قسم کی نیم حکیمی لایا ہے۔ اس کے مطابق اجارہ داری کی وجوہات سرمایہ داری نہیں بلکہ تحفظیت (Protectionism) ہے اور اسی طرح یہ دریافت کرتا ہے کہ ''سماج کی نجات ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت کے خاتمے میں نہیں بلکہ کسٹم محصولات کے کم کرنے میں ہے۔'' وہ پیش گوئی کرتا ہے کہ ''جب تک منڈی کی آزادی کو بحال نہیں کیا جاتا اُس وقت تک تمام اداروں، جیسے کاروبار، تقریر، تعلیم اور مذہب، کی آزادی خطرے میں ہے۔'' دوسرے الفاظ میں عالمی تجارت کی آزادی کی بحالی کے بغیر جمہوریت (جہاں اور جس شکل میں بھی ہے) کو انقلابی یا فاشسٹ آمریت کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن عالمی تجارت کی آزادی اندرونی تجارت (مقابلہ بازی) کی آزادی کے بغیر ناممکن ہے اور اجارہ داری کی موجودگی میں مقابلہ بازی کی آزادی ناممکن ہے۔ اِکس، جیکسن، کمنگز اور خود روزویلٹ کی طرح ڈگلس نے بدقسمتی سے اجارہ دارانہ سرمایہ داری اور اسی طرح انقلاب یا آمرانہ حکومت کے خلاف اپنا نسخہ تجویز کرنے کی تکلیف نہیں کی ہے۔
تجارت کی آزادی، مقابلہ بازی کی آزادی، مڈل کلاس کی خوشحالی کی طرح ناقابل واپسی ماضی کا حصہ ہیں۔ ماضی کو واپس لانا، چھوٹے اور درمیانے صنعت کاروں اور کاروباریوں کے لیے آزادی کی واپسی، روپے اور قرض کے نظام کو اپنے حق میں تبدیل کرنا، مارکیٹ کو ٹرسٹوں کے غلبے سے آزاد کرانا، سٹاک ایکسچینج سے پیشہ ور سٹہ بازوں کو ختم کرنا، عالمی تجارت کی آزادی کی بحالی وغیرہ وغیرہ صرف سرمایہ داری کے جمہوری اصلاح پسندوں کا نسخہ ہے۔ اصلاح پسند حتیٰ کہ مشینوں کے استعمال کو محدود کرنے کا خواب دیکھتے ہیں اور سماجی توازن کو بگاڑنے اور

لوگوں کو پریشان کرنے والی تکنیک پر پابندی لگانا چاہتے ہیں۔اس کے بارے میں ایک امریکی سائنس دان نے سخت نفرت انگیزی سے کہا کہ ظاہری طور پر ہم واپس امیبا (Amoeba) بن کر یا،اس میں ناکامی کی صورت میں، مطمئن سُور بن کر محفوظ ہو سکتے ہیں۔

ملیکان اور مارکسزم

بدقسمتی سے سائنسدان ڈاکٹر رابرٹ ملیکان بھی اسی طرح آگے کی بجائے ماضی کی طرف دیکھتا ہے۔ 07 دسمبر 1937ء میں سائنس کے دفاع میں اس نے کہا، ''امریکی اعداد و شمار دکھاتے ہیں کہ فی صد مستقل روزگار کی حامل آبادی پچھلے پچاس سالوں کے دوران مسلسل بڑھی ہے، جب سائنس کو تیزی سے لاگو کیا گیا۔'' سائنس کے دفاع کی آڑ میں سرمایہ داری کے دفاع کو درست نہیں کہا جا سکتا۔انہی پچھلے پچاس سالوں میں زمانوں کا رابطہ ٹوٹا اور معیشت اور تکنیک کا باہمی رشتہ تیزی سے تبدیل ہوا۔ملیکان نے جس دور کی بات کی ہے وہ سرمایہ داری کے زوال کی شروعات اور سرمایہ دارانہ ترقی کا عروج بھی ہے۔

اس زوال کے آغاز کو چھپانا، جو عالمی ہے، سرمایہ داری کا معذرت خواہ بننا ہے۔سوشلزم کو اس قدر سرد مہری سے اور ایسے دلائل سے رد کرنا حتیٰ کہ ہنری فورڈ کو بھی مشکل سے پسند آئے، ڈاکٹر ملیکان کہتا ہے کہ پیداوار کو بڑھائے بغیر تقسیم کا کوئی بھی نظام انسانوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ بے شک! لیکن افسوس کی بات ہے کہ مشہور طبیعیات دان لاکھوں بے روزگار امریکیوں کے لیے یہ واضح نہیں کرتا کہ وہ کس طرح قومی آمدن کو بڑھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ انفرادی اقدام کی خوبیوں اور محنت کی زیادہ پیداواریت کے بارے میں مجرد وعظ دینے سے بیروزگاروں کو روزگار نہیں ملیں گے نہ ہی بجٹ خسارہ پورا ہو گا اور نہ ہی قومی معیشت کو بند گلی سے نکالا جا سکے گا۔

مارکس کی ذہانت کی آفاقیت، مظاہر اور مختلف شعبوں کو اُن کے جبلی رابطوں میں سمجھنے کی اہلیت نے اُسے ممتاز بنا دیا۔فطری سائنس کا ماہر نہ ہونے کے باوجود وہ پہلا آدمی تھا جس نے اس شعبے میں ہونے والی عظیم دریافتوں کو بھانپ لیا تھا جیسے ڈارون کا نظریہ۔ مارکس کو پتہ تھا کہ اس کی فضیلت اس کی ذہانت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے طریقہ کار کی وجہ سے ہے۔ بورژوا ذہنیت کے مالک سائنس دان شاید اس کو سوشلزم سے مبرّا سمجھیں لیکن رابرٹ ملیکان ایک بار پھر اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ عمرانیات کے شعبے میں وہ اب بھی نیم حکیم ہیں۔ اُنہیں مارکس سے سائنسی سوچ کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

پیداوار، امکانات اور ذاتی ملکیت

1937ء کے آغاز میں کانگریس کو اپنے پیغام میں صدر روز ویلٹ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ قومی آمدن کو نوے یا سوا ارب ڈالر تک بڑھایا جائے تاہم یہ نہیں بتایا کہ کس طرح۔ یہ پروگرام اپنے آپ میں حد سے زیادہ معتدل ہے۔ 1929ء میں جب بیروزگاروں کی تعداد دو ملین تھی قومی آمدن 81 ارب ڈالر تھی۔موجودہ پیداواری قوتوں کو کام میں لا کر نہ صرف روز ویلٹ کے پروگرام کو حقیقت کا روپ دیا جا سکے گا بلکہ اس سے آگے بھی جا سکتے ہیں۔ مشینیں، خام مال، مزدور، ہر چیز دستیاب ہے۔سب سے بڑھ کر لوگوں کو ان مصنوعات کی

ضرورت ہے۔ اگر اس کے باوجود یہ منصوبہ نا قابل حصول ہے (اور یقیناً یہ نا قابل حصول ہے) تو اس کی واحد وجہ سرمایہ دارانہ ملکیت اور سماج کی بڑھتی پیداوار کی ضرورت کے درمیان نا قابل مصالحت تضاد ہے۔ مشہور حکومتی 'ممکنہ پیداواری صلاحیت کا قومی سروے' اس نتیجے پر پہنچا کہ 1929ء میں استعمال شدہ خدمات اور پیداواری لاگت تقریباً 94 ارب ڈالر تھی۔ یہ خوردہ قیمتوں کی بنیاد پر حساب لگایا گیا ہے۔ لیکن اگر حقیقی پیداواری صلاحیتوں کو استعمال میں لایا جاتا تو یہ عدد 135 ارب ڈالر تک چلا جاتا، اوسطاً 4370 ڈالر فی خاندان جو ایک شانت اور آرام دہ زندگی کے لیے کافی ہے۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ قومی سروے کا یہ تخمینہ امریکہ کی موجودہ پیداواری تنظیم کی بنیاد پر لگایا گیا ہے جو سرمایہ داری کی پر انتشار تاریخ کی وجہ سے بنی ہے۔ اگر خود اوزاروں کو ایک یکجا سوشلسٹ منصوبے کی بنیاد پر آراستہ کیا جاتا تو پیداواری تخمینہ بے پناہ بڑھ سکتا تھا اور انتہائی قلیل اوقات کار کی بنیاد پر تمام لوگوں کے لیے ایک نہایت ہی آرام دہ معیار زندگی یقینی بنایا جاسکتا تھا۔

لہٰذا سماج کو بچانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تکنیک کی ترقی کو روکا جائے، فیکٹریاں بند کی جائیں، زراعت کو تباہ کرنے کے لیے کسانوں کو انعامات دیئے جائیں، ایک تہائی مزدوروں کو بھکاری بنایا جائے یا پاگلوں کو ڈکٹیٹر بنایا جائے۔ یہ تمام تر اقدامات، جو سماجی مفادات کے ساتھ ایک بھیانک مذاق ہے، غیر ضروری ہیں۔ ضروری اور فوری کام یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو اُن کے موجودہ طفیلی مالکان سے الگ کیا جائے اور سماج کو ایک عقلی منصوبے کی بنیاد پر منظّم کیا جائے۔ تب ہی سماج کی تمام بیماریوں کا علاج ممکن ہو جائے گا۔ کام کے قابل ہر شخص کو روزگار ملے گا۔ اوقات کار بتدریج کم ہو جائیں گے۔ سماج کے تمام ارکان کی ضرورتیں تیزی سے پوری ہونگی۔ ''جائیداد''، ''بحران''، ''استحصال'' کے الفاظ منظر سے غائب ہو جائیں گے۔ بالآخر انسان حقیقی انسانیت کی اقلیم میں قدم رکھے گا۔

سوشلزم کی ناگزیریت

مارکس کہتا ہے، ''سرمائے کے بڑے بڑے مگرمچھوں کی کم ہوتی ہوئی تعداد کے ساتھ ساتھ بدحالی، جبر، غلامی، ذلت اور استحصال کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی محنت کش طبقے کی بغاوت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ تعداد میں بڑھتا ہوا ایک ایسا طبقہ جو منظّم، متحد اور سرمایہ دارانہ پیداواری عمل کے طریقہ کار کی وجہ سے ہی منظّم ہوتا ہے۔ ذرائع پیداوار کی مرکزیت اور محنت کی اشتراکیت بالآخر ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے سرمایہ دارانہ غلاف سے بغاوت کرتی ہے۔ اس غلاف کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ غاصبوں کو بیدخل کر دیا جاتا ہے۔'' یہی سوشلسٹ انقلاب ہے۔ مارکس کے نزدیک سماج کی تعمیر نو کا مسئلہ اُس کی ذاتی پسند ناپسند کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک گہری تاریخی ضرورت تھی جو ایک طرف پیداواری قوتوں کی زبردست ترقی اور دوسری طرف قانون قدر کی بنیاد پر ان قوتوں کی مزید ترقی کے امکانات کے نہ ہونے کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ مارکس کی تعلیمات سے قطع نظر، اس موضوع پر بعض دانشوروں کی تحریریں کہ سوشلزم ناگزیر نہیں بلکہ امکان ہے، کسی بھی طرح کی مواد سے عاری ہیں۔ یقیناً مارکس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سوشلزم انسانوں کے ارادوں اور عمل کے بغیر آئے گا۔ اس طرح کی باتیں احمقانہ ہیں۔ مارکس نے پیش گوئی کی کہ معاشی زوال (جس پر سرمایہ

دارانہ ارتقا ناگزیر طور پر منتج ہوگا اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے) سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں رہے گا سوائے اسکے کہ ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت بنا دی جائے۔ پیداواری قوتوں کو ایک نئے منتظم اور مالک کی ضرورت ہے اور چونکہ وجود شعور کا تعین کرتا ہے، مارکس کو یقین تھا کہ محنت کش طبقہ جلد یا بدیر، غلطیوں اور شکستوں سے سیکھتے ہوئے حقیقی معروض کو سمجھ کر اہم عملی نتائج اخذ کرے گا۔

سرمایہ دارانہ پیدا کردہ ذرائع پیداوار کو قومیانے سے ہونے والے زبردست معاشی فوائد کا اظہار نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ سوویت یونین کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے، باوجودیکہ بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سرمایہ دارانہ رجعتی عناصر مکاری سے سٹالن کی حکومت کو سوشلزم کے نظریات کے خلاف بطور بجو کے استعمال کرتے ہیں۔ درحقیقت مارکس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ایک ملک میں سوشلزم تعمیر کی جاسکتی ہے کجا کہ ایک پسماندہ ملک میں۔ سوویت یونین میں عوام کی مسلسل محرومی، مراعات یافتہ پرت کی مطلق طاقت، جس نے اپنے آپ کو قوم اور اُس کی بدحالی سے اُوپر اٹھالیا ہے اور آخر میں افسر شاہوں کی بلا روک ٹوک ڈنڈا شاہی سوشلسٹ طرز معیشت کی وجہ سے نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ گھیراؤ کی زد میں آئے سوویت یونین کی تنہائی اور پسماندگی کی وجہ سے ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس طرح کے نامساعد حالات میں منصوبہ بند معیشت نے اپنی ناقابل تسخیر فوائد کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔

سرمایہ داری کے تمام مسیحاؤں، بشمول جمہوری اور فاشسٹ، کی یہ کوشش ہے کہ سرمائے کے مگرمچھوں کی طاقت کو محدود یا کم سے کم چھپائیں تاکہ "غاصبوں کی بیدخلی" کو روکا جاسکے۔ ان سب کو پتہ ہے اور بہت سے کھلم کھلا اقرار کرتے ہیں کہ اُن کی اصلاح پسندانہ کوششوں کی ناکامی سوشلسٹ انقلاب کا باعث بنے گی۔ ان سب کی حرکتوں سے لگتا ہے کہ اُن کی سرمایہ داری کو بچانے کے طریقے رجعتی اور مایوس کن نیم حکیمی ہیں۔ پس یہ سوشلزم کی ناگزیریت کے بارے میں مارکس کے تجزیے کو نفی کا ثبوت (Proof of negative) فراہم کرتا ہے۔

سوشلسٹ انقلاب کی ناگزیریت

1929-32ء کے عظیم بحران کے دور میں فروغ پانے والی "ٹیکنوکریسی" کا پروگرام اس درست قضیے کی بنیاد پر تھا کہ معیشت کو صرف سائنس کی جدید ترین تکنیک اور سماجی خدمت پر مامور حکومت کے اتحاد سے ہی معقول بنایا جاسکتا ہے۔ یہ اتحاد تب ممکن ہے جب تکنیک اور حکومت کو نجی ملکیت کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ یہیں سے عظیم انقلابی کام کا آغاز ہوتا ہے۔ تکنیک کو نجی مفادات کے ٹولے سے آزاد کرنے اور حکومت کو سماج کی خدمت پر مامور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ "غاصبوں کو بے دخل کردیا جائے"۔ صرف ایک طاقتور طبقہ ہی جو اپنی آزادی میں مگن ہو اور جو اجارہ دارانہ غاصبوں کے خلاف ہو یہ کام کرنے کے قابل ہے۔ قابل ہنرمندوں کی پرت صرف ایک پرولتاری حکومت کے ساتھ مل کر ہی ایک حقیقی سائنسی اور عقلی (سوشلسٹ) معیشت قائم کرسکتی ہے۔

سب سے اچھا تو یہ ہوگا کہ اس مقصد کو پرامن، بتدریج اور جمہوری انداز میں حاصل کیا جائے لیکن ایک متروک سماجی نظام کبھی بھی بغیر مزاحمت کے اپنے جانشین کے لیے جگہ خالی نہیں کرے گا۔ اگر اپنے عروج کے دنوں میں نوخیز طاقتور جمہوریت دولت اور طاقت کو دولت

مند افراد کے ہاتھوں میں مجتمع ہونے سے نہ روک سکی تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک کمزور اور تباہ حال جمہوریت ساٹھ خاندانوں کی حاکمیت پر قائم سماجی نظام کو تبدیل کر دے؟ نظریات اور تاریخ بتاتے ہیں کہ شدید طبقاتی جدوجہد، انقلاب، کے نتیجے میں ہی سماجی نظام تبدیل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ میں غلامی بھی بغیر خانہ جنگی کے ختم نہ ہو سکی۔ ''طاقت پرانے سماج کی کوکھ میں جنم لینے والے نئے سماج کی دایہ ہے۔'' طبقاتی سماج کی عمرانیات کے حوالے سے مارکس کے اس بنیادی نظریے کو آج تک کوئی بھی مسترد نہ کر سکا ہے۔ صرف ایک سوشلسٹ انقلاب ہی سوشلزم کے لیے راستہ صاف کرے گا۔

مارکسزم امریکہ میں

شمالی امریکی جمہوریہ تکنیک اور پیداواری تنظیم کے شعبے میں دوسروں سے آگے نکل گیا ہے۔ نہ صرف امریکی بلکہ پوری انسانیت اس بنیاد پر تعمیر ہو گی۔ تاہم ایک ہی ملک میں سماجی عمل کے مختلف مراحل کی مختلف رفتار ہو سکتی ہے۔ یہ مخصوص تاریخی حالات پر منحصر ہے۔ جہاں امریکہ کو تکنیک کے میدان میں زبردست برتری حاصل ہے وہیں اس کے دائیں اور بائیں بازو کے معاشی نظریے بہت پسماندہ ہیں۔ جان لیوس اور فرینکلن روزویلٹ کے نظریات ایک جیسے ہیں۔ اس کے عہدے کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے لیوس کا سماجی کردار روزویلٹ سے زیادہ قدامت پسند بلکہ رجعتی ہے۔ بعض امریکی حلقوں میں ایک رجحان ہے کہ ایک یا دوسرے ریڈیکل نظریات کو بغیر کسی سائنسی تنقید کے صرف ''غیر امریکی'' کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے فرق کرنے کے معیارات کیا ہیں؟

عیسائیت کو امریکہ میں لوگرتھم، شیکسپئر کی شاعری، انسانوں اور شہریوں کے حقوق کے نظریات اور انسانی فکر کے دوسرے اہم پیداواروں کے ساتھ درآمد کیا گیا۔ آج مارکسزم بھی اسی درجہ بندی میں آتی ہے۔

وزیر زراعت ہنری والس نے مصنف پر ''عقیدوی کمزوری جو شدت سے غیر امریکی ہے'' کا الزام لگایا ہے اور روسی عقیدہ پرستی کے خلاف جیفرسن کے موقع پرستانہ رجحان کو سامنے لایا جو اپنے مخالفین سے نمٹنا جانتا ہے۔ ظاہراً والس کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں آیا ہو گا کہ سمجھوتہ کرنے کی پالیسی کسی غیر مادی قومی رجحان کی نہیں بلکہ مادی حالات کی پیداوار ہے۔ تیزی سے امیر ہوتی ہوئی قوم کے پاس مخالف طبقات میں مصالحت کرنے کے کافی مواقع ہیں۔ دوسری طرف جب سماجی تضادات تیز ہو جاتے ہیں تو مصالحت کے مواقع غائب ہو جاتے ہیں۔ امریکہ ''عقیدوی کمزوری'' سے آزاد تھا کیونکہ اس کے پاس وسیع غیر مزروعہ زمین، لامتناہی قدرتی دولت کے ذخائر اور ایسا لگتا تھا کہ ترقی کے لامحدود مواقع ہیں۔ حتیٰ کہ ان حالات کے باوجود خانہ جنگی کا وقت آنے پر مصالحت کا رجحان اُسے نہ روک سکا۔ تاہم جن مادی حالات نے ''امریکن ازم'' کی بنیاد ڈالی وہ آج کافی حد تک ماضی کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس طرح یہ روایتی امریکی نظریے کا گہرا بحران ہے۔

تجربی سوچ، جو گاہے بگاہے فوری مسئلوں کے حل تک محدود ہے، مزدور اور بورژوا حلقوں میں اس وقت تک موزوں تھی جب تک مارکس کی قدر کا قانون نہیں تھا۔ لیکن آج وہی قانون اپنے ساتھ ناقابل مصالحت تضاد میں ہے۔ معیشت کو آگے بڑھانے کی بجائے یہ اس کی بنیادیں منہدم کر رہی ہے۔ عملیت پسندی، مصالحانہ اصطفائیت پسندانہ سوچ، اپنی فلسفیانہ اوج کے ساتھ مکمل طور پر غیر موزوں ہے جب کہ

مارکسزم کو ''عقیدہ'' کہہ کر اس کی طرف نامناسب یا تحقیر آمیز رویہ نہایت ہی فضول، رجعتی اور مکمل طور پر مضحکہ خیز ہے۔ اس کے برعکس یہ روایتی ''امریکن ازم'' کی سوچ ہی ہے جو بے جان، خوف زدہ عقیدہ بن چکی ہے جو غلطیوں اور بوکھلاہٹ کو جنم دے رہی ہے۔ معاً، مارکس کی معاشی تعلیمات امریکہ کے لیے ایک خاص زیست پذیری اور تیز دھار پن حاصل کر چکی ہیں۔ اگرچہ سرمایہ عالمی مواد (زیادہ تر برطانوی) پر انحصار کرتی ہے لیکن اپنی نظریاتی بنیادوں کے حوالے سے یہ سرمایہ داری کا عمومی اور خصوصی تجزیہ ہے، جیسی کہ وہ ہے۔ بلاشبہ امریکہ کی غیر مزروعہ، غیر تاریخی سرزمین پر پرورش پانے والی سرمایہ داری مثالی سرمایہ داری کے قریب ترین ہے۔

امریکہ معاشی طور پر جیفرسن کے اصولوں کی بجائے مارکس کے نظریات کے مطابق پروان چڑھا۔ اس سے والس کی عزت بچ گئی۔ اس بات کو قبول کرنے سے قومی وقار مجروح نہیں ہوتا بالکل اسی طرح جیسے اس بات کو قبول کرنے سے کچھ نہیں ہوتا کہ امریکہ سورج کے گرد نیوٹن کے قوانین کے مطابق گھومتا ہے۔ مارکس کو امریکہ میں جتنا نظرانداز کیا جاتا ہے۔ اتنی ہی اس کی تعلیمات میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ سرمایہ بیماری کی ایک بے عیب تشخیص اور بے بدل تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے مارکس کی تعلیمات ہوور، روزویلٹ، گرین اور لیوس کی نسبت نئی ''امریکن ازم'' سے زیادہ سرشار ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ امریکی معیشت کے بحران کے بارے میں امریکہ میں بہت سی نئی تحقیق موجود ہے۔ دیانت دار معیشت دان جس حد تک امریکی سرمایہ داری کے تباہ کن رجحانات کی معروضی تصویر کشی کرتے ہیں اُن کے تجزیے (ان کی نظریاتی رجحانات سے قطع نظر جو عام طور پر ناقدانہ ہیں) بالکل مارکس کے نظریے کی براہ راست تشریحات لگتے ہیں۔ قدامت پسند روایات تب اپنا سر اٹھاتی ہیں جب یہ مصنفین شدت سے واضح نتائج سے دور بھاگتے ہیں اور اپنے آپ کو تاریک پیش گوئیوں یا ایسی نصیحتوں جیسے ''قوم کو سمجھنا چاہیئے'' ''رائے عامہ کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے'' وغیرہ وغیرہ تک محدود کرتے ہیں۔ یہ کتابیں دھار کے بغیر چاقو یا سوئی کے بغیر قطب نما کی طرح ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ماضی میں امریکہ میں عجیب اقسام کے مارکسسٹ یا تین اقسام کے مارکسسٹ تھے۔ اولاً یورپ سے آئے ہوئے مہاجر تھے جنہوں نے بھرپور کوشش کی لیکن انہیں کوئی نتیجہ نہیں ملا۔ ثانیاً ڈی لیونسٹ جیسے الگ تھلگ امریکی گروپوں نے واقعات کے تسلسل میں اپنی ہی غلطیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو ٹولیوں میں بدل دیا ہے۔ ثالثاً ایسے شوقیہ لوگ جو اکتوبر انقلاب کی طرف متوجہ ہوئے اور بطور پراسرار تعلیمات (جس کا امریکہ سے لینا دینا نہیں تھا) کے مارکسزم سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کا وقت گزر چکا ہے اب پرولتاریہ کی آزاد طبقاتی تحریک اور حقیقی مارکسزم کی صبح طلوع ہو رہی ہے۔ یہاں بھی امریکہ چند ہی چھلانگوں میں یورپ کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ ترقی پسند تکنیک اور سماجی ساخت خود ہی نظریے کے لیے راستہ ہموار کرے گی۔ امریکی سرزمین پر بہترین مارکسی نظریہ دان پیدا ہونگے۔ مارکس جدید امریکی مزدوروں کا استاد بن جائے گا۔ یہ تلخیص شدہ پہلی جلد مارکس کو مکمل سمجھنے کا پہلا قدم ثابت ہوگا۔

سرمایہ داری کا مثالی آئینہ

جب سرمایہ کی پہلی جلد چھپی تو اس وقت برطانوی بورژوازی کے عالمی غلبے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ اجناس کی معیشت کے تجریدی قوانین کا

مکمل اظہار (جو ماضی کے اثرات پر کم تر منحصر ہے) فطری طور پر ایک ایسے ملک میں ہوا جہاں سرمایہ داری اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ مارکس نے اپنے تجزیے میں زیادہ تر انگلینڈ پر انحصار کیا لیکن اُس کے مدنظر نہ صرف انگلینڈ بلکہ پوری سرمایہ دارانہ دنیا تھی۔ اس نے اپنے زمانے کے انگلینڈ کو سرمایہ داری کے بہترین ہم عصر مثال کے طور پر استعمال کیا۔

اب برطانوی غلبے کی صرف یاد باقی ہے۔ پہلا سرمایہ دارانہ ملک ہونے کے فوائد اب نقصانات میں بدل گئے ہیں۔ انگلینڈ کی تکنیکی اور معاشی ساخت اب گل سڑ چکی ہے۔ ملک اپنی عالمی حیثیت کے لیے سرگرم معاشی طاقت کی بجائے نوآبادیاتی سلطنت پر انحصار کر رہا ہے جو ماضی کی وراثت ہے۔ اتفاقاً یہی چیز فاشسٹوں کی عالمی غنڈہ گردی کے لیے چیمبرلائین کی مسیحی کمک کی وضاحت کرتی ہے جس نے ہر کسی کو حیران کر دیا۔ انگریز بورژازی اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا معاشی زوال عالمی سطح پر اس کی حیثیت سے میل نہیں کھاتا اور ایک نئی جنگ برطانوی سلطنت کے انہدام کا باعث بنے گی۔ فرانس کی ''امن پسندی'' کی معاشی بنیاد بھی حقیقت میں یہی ہے۔

اس کے برعکس جرمنی نے اپنی تیز سرمایہ دارانہ ترقی کے دوران تاریخی پسماندگی کے فوائد کو استعمال کرتے ہوئے یورپ کی بہترین تکنیک سے اپنے آپ کو مسلح کیا ہے۔ محدود قومی بنیاد اور کمتر قدرتی وسائل کی وجہ سے جرمنی کی متحرک ضرورت کی سرمایہ داری نام نہاد عالمی طاقتوں کے توازن میں سب سے دھماکہ خیز عامل میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ہٹلر کا مرگی زدہ نظریہ دراصل جرمن سرمایہ داری کی مرگی کے مرض کا عکس ہے۔

متعدد بیش قیمت تاریخی کردار کی حامل فوائد کے علاوہ، امریکہ کی ترقی لامحدود بڑے رقبے اور جرمنی کی نسبت بے نظیر قدرتی دولت کی وجہ سے ہوئی۔ برطانیہ کو واضح طور پر پیچھے دھکیلتے ہوئے شمالی امریکی جمہوریہ اس صدی کے آغاز پر عالمی بورژوازی کا واحد قلعہ بن گیا۔ یہاں سرمایہ داری میں پوشیدہ تمام تر امکانات کو بہترین اظہار مل گئی۔ ہمارے سیارے پر کسی بھی دوسری جگہ بورژوازی ڈالر جمہوریہ میں اپنی حاصلات سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتی جو بیسویں صدی کی سرمایہ داری کی سب سے کامل شکل ہے۔

اسی وجہ سے مارکس نے اپنی تشریحات کی بنیاد انگریزی اعداد و شمار، پارلیمانی رپورٹس پر رکھی۔ اسی طرح ہم نے بھی اپنے معمولی سے تعارف میں امریکہ کی معاشی اور سیاسی تجربات سے متعلق مواد پر انحصار کیا ہے۔ کسی بھی دوسرے سرمایہ دارانہ ملک کے ملتے جلتے اعداد و شمار کو پیش کرنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ نتائج یکساں ہونگے لیکن صرف مثالیں غیر دلچسپ ہونگی۔

فرانس میں پاپولر فرنٹ کی معاشی پالیسی، اس کے ایک ماہر مالیات کے الفاظ میں ''بالشتیوں کے لیے'' نیوڈیل کی ایک شکل ہے۔ یہ مکمل طور پر واضح ہے کہ نظریاتی تجزیے میں چھوٹی مقدار کی نسبت بڑی مقدار سے نمٹنا بہت آسان تر ہے۔ روزویلٹ کا تجربہ دکھاتا ہے کہ صرف ایک معجزہ ہی عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو بچا سکتا ہے۔ لیکن اتفاق سے، سرمایہ دارانہ پیداوار کی ترویج معجزوں کی پیداوار روک دیتی ہے۔ منتروں اور دعاؤں کی بہتات ہے لیکن معجزے ہوتے ہی نہیں۔ تاہم ایک بات طے ہے کہ اگر سرمایہ داری کو دوبارہ جوان کرنے کا معجزہ کہیں پر ہو سکتا ہے تو وہ کہیں اور نہیں صرف امریکہ میں ہی ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جو کام دیو نہ کر سکے وہ یہ بالشتیے کہاں کر سکتے ہیں۔ اس سادہ نتیجے پر پہنچنے کے لیے ہمیں امریکی معیشت کو دیکھنا چاہیئے۔

بالا دست ممالک اور نوآبادیات

مارکس نے سرمایہ کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ میں لکھا، ''صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک کو کم ترقی یافتہ ملک میں اپنا مستقبل نظر آتا ہے۔'' کسی بھی صورت میں اس خیال کو حرف بہ حرف نہیں لینا چاہیئے۔ بلاشبہ سرمایہ دارانہ ارتقا کے راستے پر چلنے والے ہر ملک کو پیداواری قوتوں کی ترقی اور گہرے ہوتے ہوئے سماجی تضادات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم رفتار اور معیارات کا عدم توازن، جو انسانی ترقی میں ہر وقت موجود تھی اور بنیادی طور پر اس کی تاریخی اور فطری وجوہات ہیں، سرمایہ داری کے تحت خصوصی طور پر نہ صرف تیز ہوئے بلکہ مختلف معاشی اقسام کے ممالک کے درمیان غلامی، استحصال اور جبر پر مبنی ایک پیچیدہ باہمی انحصار نے جنم لیا۔

صرف چند ممالک ہی دستکاری سے گھریلو پیداوار اور پھر فیکٹری کے باقاعدہ اور منطقی ترقی کے عمل سے گزرے جس کا مارکس نے تفصیل سے تجزیہ کیا تھا۔ تجارتی، صنعتی اور مالیاتی سرمائے نے پسماندہ ممالک پر باہر سے یلغار کیا اور جزوی طور پر قدیم مقامی معیشت کی اشکال کو تباہ کر دیا اور کسی حد تک انہیں مغرب کے عالمی صنعتی اور بینکنگ کے نظام سے جوڑ دیا۔ سامراجیت کے کوڑے کے زیر اثر نوآبادیات اور نیم نوآبایات کو درمیانی مرحلوں کو پھلانگنا پڑا جب کہ اسی لمحے وہ ایک یا دوسری سطح پر مصنوعی طور پر چمٹے بھی رہے۔ ہندوستان کا ارتقا انگلینڈ کے ارتقا کا تکرار نہیں بلکہ اس کا ضمیمہ ہے۔ تاہم ہندوستان جیسے پسماندہ اور غلام ممالک کی مشترکہ ترقی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انگلینڈ کے ارتقا سے مارکس کا اخذ کیا گیا کلاسیکی طریقہ کار ذہن میں رکھا جائے۔ قدر کا قانون لندن شہر کے سٹہ بازوں کے حساب کتاب پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح دور افتادہ حیدر آباد میں رقوم کی تبدیلی کے کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مؤخرالذکر میں یہ زیادہ سادہ اور کم عیار رہے۔

ارتقائی عدم توازن ترقی یافتہ ممالک کے لیے زبردست فائدے کا باعث بنا جو اگرچہ مختلف حوالوں سے پسماندہ ممالک کی قیمت پر (ان کا استحصال کر کے، انہیں اپنی نوآبادیات بنا کر یا کم سے کم انہیں سرمایہ دارانہ اشرافیہ میں داخل ہونے سے روک کر) ہی ترقی کرتے رہے۔ سپین، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس نے اتنی دولت نہ صرف اپنی پرولتاریہ کی قدر محنت سے اور اپنی پیٹی بورژوازی کو تباہ کر کے بلکہ اپنی نوآبادیات کی منظّم لوٹ مار سے بھی حاصل کی۔ اقوام کے استحصال کے ذریعے طبقات کے استحصال میں مزید شدت لائی گئی۔ اپنی نوآبادیات سے زبردست منافع کما کر بالا دست ممالک کی بورژوازی اپنی پرولتاریہ بالخصوص اس کی اُوپری پرتوں کو ایک مراعات یافتہ مقام دے سکی۔ اس کے بغیر کسی بھی طرح کی مستحکم جمہوری حکومت بالکل ناممکن ہوتی۔ اپنی واضح شکل میں بورژوا جمہوریت ایک ایسی حکومت ہے جو صرف امیر ترین اور استحصالی اقوام کی پہنچ میں ہے۔ قدیم جمہوریت غلامی پر کھڑی تھی۔ سامراجی جمہوریت نوآبادیات کی لوٹ مار پر۔

رسمی طور پر امریکہ کی تقریباً کوئی نوآبادیات نہیں۔ اس کے باوجود تاریخ کی تمام قوموں سے سب سے مراعات یافتہ ہے۔ یورپ کے سرگرم مہاجروں نے حد سے زیادہ امیر براعظم پر قبضہ کر لیا، مقامی آبادی کا صفایا کر دیا گیا، میکسیکو کے بہترین حصوں کو ہتھیا لیا اور عالمی دولت کے ایک بڑے حصے کا دعویدار بن گئے۔ اس طرح سے ہاتھ آنے والی دولت حتیٰ کہ آج زوال کے عہد میں بھی جمہوریت کا پہیہ چلانے کے کام آ رہی ہے۔

حالیہ تاریخی تجربات اور نظریاتی تجزیے بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جمہوریت کی ترقی اور استحکام طبقاتی تضادات کی کشمکش کے بالعکس متناسب ہے۔کم مراعات یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک، (ایک طرف روس، دوسری طرف جرمنی، اٹلی وغیرہ) جو متعدد اور مستحکم مزدور اشرافیہ پیدا کرنے میں ناکام رہے، میں جمہوریت کبھی بھی کسی سطح پر پروان نہ چڑھ سکی اور نسبتاً آسانی سے آمریت پر منتج ہوئی۔تاہم سرمایہ داری کی مسلسل بڑھتی ہوئی بدحالی مراعات یافتہ ترین اور امیر ترین اقوام کی جمہوریتوں کو اسی ڈگر پر لے جا رہی ہے۔فرق صرف تاریخ کا ہے۔مزدوروں کے حالات زندگی کی بے قابو تنزلی اس بات کو ناممکن بنا رہی ہے کہ بورژوازی حتیٰ کہ بورژوا پارلیمانیت کے محدود دائرے میں بھی عوام کو سیاسی زندگی میں شمولیت کا حق دیں۔جمہوریت کی فاشزم کے ذریعے بیدخلی کے واضح عمل کی کوئی بھی دوسری تشریح چیزوں کی اصلی حالت کی خیال پرستانہ تحریف، دھوکہ یا خود فریبی ہے۔

جہاں سامراجیت سرمائے کے پرانے ملکوں میں جمہوریت کو تباہ کر رہی ہے وہیں یہ پسماندہ ممالک میں جمہوریت کے ابھار کو روک رہی ہے۔یہ حقیقت کہ نئے عہد میں نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ممالک میں سے ایک بھی اپنا جمہوری انقلاب مکمل نہ کر سکے (سب سے بڑھ کر زرعی تعلقات کے شعبے میں) سب کے سب سامراجیت کی وجہ سے ہے جو معاشی اور سیاسی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اجارہ دارانہ حکمران اور ان کی حکومتیں پسماندہ ممالک کی قدرتی دولت کو لوٹتے ہیں اور جان بوجھ کر ان کی آزادانہ صنعتی ترقی کو روکتے ہیں اور اسی لمحے مقامی استحصالیوں کے سب سے رجعتی، طفیلی، نیم جاگیردارانہ ٹولوں کو مالیاتی، سیاسی اور فوجی امداد دیتے ہیں۔مصنوعی طور پر قائم رکھی گئی زرعی بربریت موجودہ عالمی معیشت کی سب سے بھیانک بیماری ہے۔نوآبادیاتی عوام کی اپنی آزادی کی جنگ، درمیانی مرحلوں کو پھلانگتے ہوئے لازمی طور پر سامراجیت کے خلاف جنگ میں تبدیل ہوگی اور اس طرح وہ بالادست ممالک کی پرولتاریہ کی جدوجہد کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔نوآبادیاتی بغاوتیں اور جنگیں سرمایہ دارانہ دنیا کی بنیادیں ہلا دیں گی اور اس کے دوبارہ ابھار کو پہلے سے بڑھ کر ناممکن بنا دیں گی۔

عالمی منصوبہ بند معیشت

سرمایہ داری نے تکنیک کو اعلیٰ سطح پر لے جا کر اور دنیا کے تمام حصوں کو معاشی بندھنوں میں جوڑ کر دو تاریخی کارنامے انجام دیئے ہیں۔اس طرح اس نے ہمارے سیارے کے وسائل کو منظّم طریقے سے استعمال کرنے کے لیے مادی بنیادیں فراہم کرنے کا دعویٰ کیا۔تاہم سرمایہ داری یہ فوری فریضہ سرانجام دینے کے قابل نہیں ہے۔اس کے پھیلاؤ کی کوششوں کا مقصد محدود قومی ریاستیں، کسٹم ہاؤسز اور افواج ہیں۔ لیکن پیداواری قوتیں بہت پہلے ہی قومی ریاست کی حدود کو پھلانگ چکی ہیں۔اس طرح ایک ترقی پسند تاریخی عامل ایک ناقابل برداشت رکاوٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔سامراجی جنگیں ریاستی سرحدوں کے خلاف پیداواری قوتوں کی بغاوتیں ہیں جو ان کو محدود کرتی ہیں۔نام نہاد خود کفالیت (Autarchy) کے پروگرام کا خود کفیل الگ تھلگ معیشت کی طرف مراجعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ایسا لگ رہا ہے ہے کہ قومی بنیادوں کو ایک نئی جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

ورسائی کے معاہدے پر دستخط کے بعد عمومی طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا کو بہتر طریقے سے تقسیم کر دیا گیا ہے۔لیکن حالیہ واقعات نے ہمیں یہ بات یاد دلا دی ہے کہ ہمارے سیارے پر ابھی تک ایسی جگہیں موجود ہیں جنہیں ابھی تک نہیں لُوٹا گیا یا اچھی طرح سے نہیں لُوٹا گیا ہے۔ اٹلی نے حبشہ (Abyssinia) پر قبضہ کرلیا ہے۔جاپان چین کو ہتھیانا چاہتا ہے۔اپنی سابقہ نوآبادیات کی واپسی کے انتظار سے تھک ہار کر جرمنی نے چیکوسلواکیہ کو اپنی نوآبادی بنالیا ہے۔اٹلی البانیہ میں گھس گیا۔جزیرہ نما بلقان کی قسمت پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔لاطینی امریکہ میں ''پردیسیوں'' کی مداخلت سے امریکہ پریشان ہے۔نوآبادیات کے لیے جدوجہد سامراجی سرمایہ داری کی پالیسی کا خاصہ ہے۔ دنیا کو چاہے کتنا ہی مکمل طور پر تقسیم کرلیا جائے یہ عمل رکے گا نہیں بلکہ سامراجی قوتوں کے درمیان تبدیل ہوتے تعلقات کے مطابق تقسیم نو کا سوال بار بار ابھرے گا۔دوبارہ ابھرتی ہوئی اسلحہ بندی، سفارتی تنازعات اور جنگی اتحادوں کی یہی اصل وجوہات ہیں۔

آنے والی جنگ کو جمہوریت اور فاشزم کے نظریات کے مابین جنگ کے طور پر پیش کرنے کی تمام کوششیں جہالت یا بیوقوفی کی اقلیم سے تعلق رکھتی ہیں۔سیاسی اشکال تبدیل ہوتی ہیں لیکن سرمایہ دارانہ لالچ قائم رہتی ہے۔اگر کل رود بار انگلستان کے دونوں اطرف ایک فاشسٹ حکومت قائم ہوجائے (کوئی بھی اس امکان کو آسانی سے رد نہیں کرسکتا) تو پیرس اور لندن کے آمر اپنی نوآبادیاتی مقبوضات سے بالکل اسی طرح دستبردار نہیں ہونگے جس طرح ہٹلر اور مسولینی اپنے نوآبادیاتی دعوؤں سے دستبردار نہیں ہونگے۔دنیا کی تقسیم نو کے لیے غضبناک اور مایوسانہ جدوجہد لازمی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے جان لیوا بحران سے جنم لیتی ہے۔

جزوی اصلاحات اور پیوند لگانے سے کوئی بہتری نہیں آئے گی۔تاریخی ارتقا اس فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکا ہے کہ صرف عوام کی براہ راست مداخلت ہی رجعتی رکاوٹوں کو توڑ کر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈال سکتی ہے۔ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کا خاتمہ منصوبہ بند معیشت کی پہلی شرط ہے یعنی انسانی تعلقات کی اقلیم میں دلیل کو متعارف کرانا، پہلے قومی اور پھر عالمی سطح پر۔جب یہ شروع ہو، تو سوشلسٹ انقلاب بے انتہا عظیم طاقت کے ساتھ فاشزم سے بھی زیادہ تیزی سے ہر ملک میں پھیلے گا۔ترقی یافتہ ملکوں کی مثال اور ان کی مدد سے پسماندہ ممالک بھی سوشلزم کے بہاؤ میں آجائیں گے۔مکمل طور پر بوسیدہ کسٹم کی محصولی دیواریں منہدم ہوجائیں گی۔وہ تضادات جو یورپ اور پوری دنیا کو ٹکڑوں میں بانٹتے ہیں، یورپ اور دنیا کے دوسرے حصوں کی متحدہ سوشلسٹ ریاستوں میں فطری اور پرامن انداز میں حل ہوجائیں گے۔انسانیت آزاد ہوکر اپنی معراج کو پہنچے گی۔